الرسالہ
Al-Risala

July 1995 • Issue 224 • Rs. 7

اشتعال انگیز نعرہ لگانے والوں کے اوپر
فساد کرنے کی ذمہ داری ہے، اور
اشتعال انگیز نعرہ پر بھڑک اٹھنے والوں کے اوپر
فساد کو نہ روکنے کی ذمہ داری۔



Tiles from Takyeci Ibrahim Aga Mosque, Turkey



الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۴

فہرست — صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 ☐ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

چپ رہنا

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور آخرت کی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے کہا کہ تم میں سے جو شخص کچھ پوچھنا چاہے وہ پوچھے، میں اس کا جواب دوں گا۔ مگر یہ سن کر لوگوں کا حال یہ ہوا کہ شدت احساس سے وہ رونے لگے (فاکثر الناس فی البکاء) فتح الباری ۲/۲۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عرب میں نفاق اور ارتداد پھیل گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ جس شخص کی وجہ سے مسلمانوں کو خدا کی نصرت ملتی تھی، وہ شخص دنیا سے چلا گیا۔ بہت سے قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نازک حالت میں خلیفۂ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں صحابہ کو جمع کیا اور حالات کا ذکر کرتے ہوئے ان سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب یہ تقریر کی تو لوگوں کا حال یہ ہوا کہ وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئے (فاطرقوا طویلاً) حیات الصحابہ ۱/۴۲۲

اس طرح کے واقعات جو کتابوں میں آئے ہیں وہ صحابۂ کرام کا مزاج بتاتے ہیں۔ صحابہ آج کل کے لوگوں کی طرح بڑھ بڑھ کر بولتے نہیں تھے۔ بلکہ اکثر حالات میں وہ چپ رہنا پسند کرتے تھے۔

چپ رہنا بے عملی نہیں، وہ سراپا عمل ہے۔ ایسے مواقع پر جو آدمی چپ ہو جائے وہ دراصل سوچ رہا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں پر غور کر رہا ہے۔ وہ انسان سے بات کرنے کے بجائے اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے دعاؤں میں مشغول ہے۔ چپ رہنا آدمی کے سنجیدہ ہونے کی علامت ہے، اور بولنا اکثر اوقات آدمی کی بے حسی اور غیر ذمہ داری کی علامت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ مگر صحابہ پوچھنے کے بجائے رونے لگے۔ اللہ سے ڈرنے والے انسان کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں پر ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں معلوم باتوں کی ذمہ داری ہی اب تک ادا نہ کر سکا۔ پھر میں اور باتیں پوچھوں تو کس لیے پوچھوں۔ یہ احساس احتساب اس پر خاموشی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ بے محابا ہو کر بولنے لگے۔

قرآن سے تعلق

امام شافعی (۲۰۴ - ۱۵۰ھ) کو اصول فقہ کا موسس کہا جاتا ہے۔ علم و فضل کے علاوہ دینداری اور تقویٰ میں بھی وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کا قول ان کے بارہ میں ہے کہ ـــــ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی نسبت اسلام سے اس درجہ قوی ہو جتنی اپنے زمانہ میں امام شافعی کی تھی۔

امام شافعی کی عمر ابھی دس سال سے بھی کم تھی کہ انھوں نے قرآن کا حفظ مکمل کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تین دن میں قرآن کی ایک تلاوت مکمل کر لیتے تھے۔ ان کو قرآن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ہر مسئلہ کی اصل قرآن سے معلوم ہو جائے۔

تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ امت کا اجماع دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ امام شافعی کو یہ تلاش ہوئی کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کیا کہ قرآن کو بار بار پڑھتے اور کوئی ایسی آیت تلاش کرتے جس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہو سکے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کوشش میں امام موصوف نے ۳۰۱ بار پورے قرآن کو پڑھ ڈالا۔ بالآخر انھوں نے اجماع کے حجت ہونے کی دلیل قرآن سے معلوم کر لی۔ ایک روز وہ تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۵ پر پہنچے تو اچانک ان پر منکشف ہوا کہ اس آیت میں اجماع کے حجت ہونے کی شرعی دلیل موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے :

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نوله ما تولیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا	اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس پر حق ظاہر ہو چکا اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ چلا تو جو کچھ وہ کرتا ہے اس کو ہم کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام شافعی نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہاں سبیل المومنین سے وہی چیز مراد ہے جس کو ہم اجماع امت کہتے ہیں۔

دور اول کے اہل ایمان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ کو قرآن سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خواہ اس کی خاطر انھیں سینکڑوں بار پورا قرآن پڑھنا پڑے۔ ان کو اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک وہ کسی چیز کے بارہ میں قرآن کا حکم دریافت نہ کر لیں۔ مگر اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن کا استعمال ان کے یہاں یا تو برکت کے لئے ہوتا ہے یا صرف تلاوت کے لئے۔

خاموشی ضروری ہے

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو تو اس کو چاہیے کہ بھلی بات بولے ورنہ چپ رہے (من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت)

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ بولنا۔ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں بولنا انتہائی ضروری ہوتا ہے اس لیے اس شخص کو گونگا شیطان (شیطان اخرس) کہا گیا ہے جو بولنے کے موقع پر نہ بولے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جب کہ چپ رہنا ہی زیادہ صحیح اور ضروری ہے۔

خاموشی کے ضروری ہونے کی ایک مثال غزوۂ احد کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے تھے اور ایک غار میں لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ دشمنوں نے اعلان کر دیا کہ محمد قتل کر دیئے گیے۔ صحابہ پر سراسیمگی چھا گئی۔ اس دوران ایک صحابی کی نظر آپ پر پڑی۔ وہ بول پڑے کہ رسول اللہ یہاں ہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بولے بغیر اشارہ سے ان کو منع کیا کہ چپ رہو (اشار الیہ الرسول ان اصمت) اس کی ایک مثال وہ حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنے ساتھی سے کہو کہ چپ رہو، جب کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو تم نے لغو فعل کیا (اذا قلت لصاحبك اسکت والامام یخطب فقد لغوت)

انفرادی مجالس میں بھی خاموشی کا یہ اصول ضروری ہے۔ مگر جب معاملہ قوم کا ہو تو اس کی اہمیت لاکھوں گنا بڑھ جاتی ہے۔ کسی نازک موقع پر ایک رہنما کی خاموشی ایک بڑے فساد کو روکنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی طرح ایک رہنما کی بے موقع تقریر ایک ایسا فساد برپا کر سکتی ہے جس میں سیکڑوں انسان مارے جائیں اور کروروں روپے کی جائداد جلا کر خاک کر دی جائے۔ اسی مفہوم میں سسٹر کنسولتا (Sister Consolata) نے کہا ہے کہ کسی قوم کی ناکامیوں کی سب سے زیادہ تعداد کا سبب خاموشی کے اصول کو توڑنا ہے:

The greatest number of failings in a community
come from breaking the rule of silence.

عقیدہ اور استدلال

مانچسٹر کالج، آکسفورڈ (انگلینڈ) سے ایک جرنل نکلتا ہے۔ اس کا نام فیتھ اینڈ ریزن (Faith and Reason) ہے۔ اس کے شمارہ نمبر ۱۳۴ (۱۹۹۲) میں ڈاکٹر پال بیڈھم (Paul Badham) کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــ ایمان اور عقلیت کے درمیان تعلق:

The Relationship between Faith and Reason

پروفیسر بیڈھم نے اپنا یہ مقالہ نومبر ۱۹۹۱ میں ماسکو کی ایک فلسفیانہ کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ ان کی بابت مذکورہ جرنل میں یہ الفاظ درج ہیں:

Paul Badham is Professor of Theology and Religious Studies at St. David's College, Lampeter, in the University of Wales. His paper in this issue was presented to a Conference of the Institute of Philosophy of the Russian Academy of Sciences in Moscow in November, 1991.

اس مقالہ کا مکمل اردو ترجمہ اسلام اور عصر جدید (نئی دہلی) کے شمارہ اپریل ۱۹۹۲ میں چھپ چکا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید جمال الدین صاحب کے قلم سے ہے۔ میرے سامنے اصل انگریزی جرنل کا مذکورہ شمارہ ہے۔

پروفیسر بیڈھم کا یہ مقالہ اپنے موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ تاہم پروفیسر موصوف نے بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن سے راقم الحروف کو اتفاق نہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں یہ لکھا ہے کہ فلسفیانہ قطعیت (philosophical certainty) کو مذہبی ایقان (religious certitude) کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مذہبی فلاسفر کی حیثیت سے میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ایمان کو کبھی بھی سائنسی علم والی قطعیت کے درجہ پر نہیں رکھا جاسکتا:

As a philosopher of religion I feel compelled to acknowledge that faith could never be placed on the same level of certainty as scientific knowledge. (p. 6)

مگر اس کے برعکس میرا احساس یہ ہے کہ ایمان و عقیدہ کو اسی قطعیت کے درجہ میں مانا جا سکتا ہے جس درجہ میں سائنسی نظریات کو مانا جاتا ہے۔ کم از کم بیسویں صدی میں اب دونوں کے درمیان کوئی حقیقی فرق نہیں۔

اصل یہ ہے کہ علم حقائق دو قسم کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ جس کو برٹرینڈ رسل نے چیزوں کا علم (knowledge of things) کہا ہے اور دوسرا وہ جس کو وہ حقیقتوں کا علم (knowledge of truths) کہتا ہے۔ یہ دوگانہ تقسیم مذہب میں بھی ہے اور سائنس میں بھی۔ مثلاً جو علماءِ سائنس حیاتیاتی ارتقاء کو سائنسی حقیقت کہتے ہیں ان کے نزدیک اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے مختلف انواع (species) کے جسمانی مظاہر کا معاملہ۔ اور دوسرا ہے وہ قانونِ ارتقاء جو انواع کی تبدیلیوں کے درمیان مخفی طور پر جاری رہتا ہے۔

ایک ارتقائی عالم جب انواع حیات کے جسمانی مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے تو گویا کہ وہ "اشیاء" کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ ارتقائی قانون کا مطالعہ کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے موضوع کے اس پہلو کا مطالعہ کر رہا ہوتا ہے جس کو اوپر کی تقسیم میں "حقیقت" کہا گیا ہے۔

ہر ارتقائی عالم جانتا ہے کہ دونوں پہلوؤں کے درمیان نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ اس معاملہ میں جہاں تک اشیاء یا شواہد ارتقاء کے مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں براہ راست دلائل قابل حصول ہیں۔ مثال کے طور پر متحجرات (fossils) جو کھدائی کے ذریعہ زمین کی تہوں سے کثرت سے برآمد کئے گئے ہیں، ان کا مطالعہ مشاہداتی سطح پر ممکن ہے۔

اس کے برعکس حقائق یا قانون ارتقاء کے معاملہ میں موضوعی شواہد نہ ہونے کی وجہ سے اس پر براہ راست استدلال ممکن نہیں۔ مثلاً ارتقائی عمل کے دوران اشکال میں اچانک تبدیلیوں (mutations) کا نظریہ، جو تمام تر قیاسات پر مبنی ہے نہ کہ براہ راست مشاہدات پر۔ اس دوسرے معاملہ میں خارجی تغیر تو دکھائی دیتا ہے، مگر قانونِ تغیر بالکل نظر نہیں آتا۔ اسی لئے ہر عالم ارتقاء موضوع کے اس دوسرے پہلو میں بالواسطہ استدلال سے کام لیتا ہے جس کو علم منطق میں استنباطی استدلال (inferential argument) کہا جاتا ہے۔

تبدیلی کا یہ نظریہ ارتقاء کی بنیاد ہے۔ تاہم اس معاملہ کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک جزء مشاہدہ

میں آتا ہے۔ مگر اس کا دوسرا جزء مکمل طور پر ناقابل مشاہدہ ہے۔ وہ صرف استنباط کے اصول سے کام لے کر فلسفۂ ارتقا میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ ایک عام واقعہ ہے کہ انسان یا جانور سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ سب ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے۔ ان میں مختلف اعتبار سے کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس حیاتیاتی مظہر کا سائنسی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ رحم مادر میں بچہ کے جینیز کے اندر اچانک طور پر خود بخود تبدیلیاں (spontaneous changes) پیدا ہوتی ہیں۔ یہی تبدیلیاں ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہونے والے بچوں میں فرق کا سبب ہیں۔

اولاد میں ایک دوسرے کے درمیان یہ فرق ایک مشاہداتی واقعہ ہے۔ مگر اس کے بعد اس مشاہدہ کی بنیاد پر جو ارتقائی فلسفہ بنایا گیا ہے وہ خود مکمل طور پر ناقابل مشاہدہ ہے اور صرف قیاسی استنباط کے ذریعہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ گویا اشیاء ارتقا قابل مشاہدہ ہیں اور حقائق ارتقا ناقابل مشاہدہ۔

یہاں ارتقائی عالم یہ کرتا ہے کہ ایک سرے پر وہ ایک بکری کو رکھتا ہے اور دوسرے سرے پر ایک زرافہ کو۔ اس کے بعد وہ فاسل کے کچھ درمیانی نمونوں کو لے کر یہ نظریہ بناتا ہے کہ ابتدائی بکری کے کئی بچوں میں سے ایک بچہ کی گردن اتفاقاً کچھ لمبی تھی۔ اس کے بعد اس لمبی گردن والی بکری کی اولاد ہوئی تو اس میں گردن کی یہ لمبائی کچھ اور بڑھ گئی۔ اسی طرح کروڑوں سال کے دوران گردن کی یہ لمبائی نسل در نسل جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ ابتدائی بکری کی اگلی اولاد آخر کار زرافہ جیسا جانور بن گئی۔ اسی نظریہ کے تحت چارلس ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع میں لکھا ہے کہ مجھ کو یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ایک معمولی کھردار چوپایہ زرافہ جیسے جانور میں تبدیل ہو سکتا ہے:

> ...it seems to me almost certain that an ordinary hoofed quadruped might be converted into a giraffe. (p. 169)

اس معاملہ میں بکری کی اولاد میں فرق ہونا بذات خود ایک معلوم واقعہ ہے۔ مگر اس فرق کا کروروں سال تک نسل در نسل جمع ہوتے ہوئے اس کا زرافہ بن جانا، مکمل طور پر ناقابل مشاہدہ اور ناقابل تجربہ ہے۔ وہ صرف مشاہدہ کی بنیاد پر استنباط کے ذریعہ اخذ کیا گیا ہے۔ نہ کہ براہ راست طور پر خود مشاہدہ کے ذریعہ۔

ٹھیک یہی معاملہ مذہب کے موضوع کا بھی ہے۔ مذہب کے مطالعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ

آپ اس کی تاریخ، اس کی شخصیات، اس کے احکام اور اس کے رسوم و رواج کا مطالعہ کریں۔ یہ مذکورہ تقسیم کے مطابق گویا اشیاء مذہب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس پہلو سے مذہب میں بھی موضوعی معلومات دستیاب ہیں۔ اس لئے یہاں مذہب کا مطالعہ بھی ٹھیک اسی طرح براہ راست شواہد کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے جس طرح حیاتیاتی ارتقاء کے حصہ اول میں کیا جاتا ہے۔

مذہب کے مطالعہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو عام طور پر غیبیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو ہماری محسوس دنیا سے ماورا ہیں۔ یعنی خدا اور فرشتوں کا وجود، وحی کی حقیقت، جنت اور دوزخ کا عقیدہ وغیرہ۔ مذہب کے اس دوسرے پہلو میں براہ راست شواہد موجود نہیں ہیں۔ اس لئے اس اعتبار سے مذہب کا مطالعہ اس منطقی اصول کی روشنی میں کیا جائے گا جس کو شواہد کی بنیاد پر استنباط کہا جاتا ہے۔ یعنی وہی منطقی اصول جس کو علماء ارتقاء اپنے نظریہ کے دوسرے پہلو کے مطالعہ میں استعمال کرتے ہیں۔

اس تجزیہ کی روشنی میں دیکھئے تو مذہب اور سائنس دونوں کا معاملہ بالکل یکساں ہے۔ دونوں ہی میں دو الگ الگ حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو علمی قطعیت (scientific certainty) پر قائم ہے اور جس میں براہ راست استدلال ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علمی استنباط (scientific inference) پر مبنی ہے اور جس کو ثابت کرنے کے لئے صرف بالواسطہ استدلال کا اصول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس علمی تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

پروفیسر بیڈھم کا غیر ضروری احساس کمتری اس لئے ہے کہ وہ مذکورہ فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو گڈ مڈ کر رہے ہیں۔ اور غیر صحیح تقابل کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ سائنس کے پہلے جزء کا مقابلہ مذہب کے دوسرے جزء سے کر رہے ہیں اور مذہب کے دوسرے جزء کو سائنس کے پہلے جزء کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس غیر صحیح تقابل نے وہ صورت پیدا کی ہے جو ان کے مقالہ میں نظر آتی ہے۔

اگر پروفیسر موصوف سائنس کے پہلے جزء کا مقابلہ مذہب کے پہلے جزء سے کریں اور اسی طرح سائنس کے دوسرے جزء کو مذہب کے دوسرے جزء کی روشنی میں دیکھیں تو ان کا احساس کمتری ختم ہو جائے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ خالص اصولی اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، کیونکہ

سائنس کے دونوں اجزاء میں دو الگ الگ طرز استدلال استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنس کے پہلے جزء میں جو استدلال مستعمل ہے وہ مذہب کے بھی پہلے جزء میں قابل حصول ہے۔ اسی طرح سائنس کے دوسرے جزء میں جو استدلال استعمال ہوتا ہے وہی مذہب کے دوسرے جزء میں بھی عین ممکن ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف برٹرینڈ رسل جیسے شخص نے کیا ہے جو فلسفۂ الحاد کا امام سمجھا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے میں عیسائی کیوں نہیں :

Why I am not a Christian

اس کتاب کے آغاز میں برٹرینڈ رسل نے اس پر بحث کی ہے کہ معقول استدلال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب بدھ ازم، ہندوازم، مسیحیت اور اسلام غلط اور بے حقیقت ہیں منطقی طور پر ان کی معقولیت کو ثابت کرنا ممکن نہیں۔ جو لوگ مذہب کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ اس کو اپنی قومی روایات کے زور پر اختیار کئے ہوئے ہیں نہ کہ دلائل کے زور پر۔

تاہم برٹرینڈ رسل نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل مذہب کے دلائل میں سے ایک دلیل ایسی ہے جو خالص منطقی یا غیر علمی نہیں۔ میری مراد اس چیز سے ہے جس کو نظم سے استدلال کہا جاتا ہے۔ تاہم اس دلیل کو ڈارون نے رد کر دیا ہے:

> There is one of these arguments which is not purely logical. I mean the argument from design. This argument, however, was destroyed by Darwin.

برٹرینڈ رسل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے وجود پر اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں جب نظم ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک ناظم ہو۔ یعنی جب ڈیزائن ہے تو ڈیزائنر کا ہونا بھی لازمی ہے۔ برٹرینڈ رسل اعتراف کرتا ہے کہ یہ طریق استدلال اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی طریق استدلال ہے جس کو سائنسی نظریات کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم اس اعتراف کے باوجود برٹرینڈ رسل یہ کہہ کر اس کو قبول نہیں کرتا کہ ڈارونزم نے اس کو رد کر دیا ہے۔

مگر یہ سراسر ایک بے بنیاد بات ہے۔ کیوں کہ ڈارون کے نظریہ کا تعلق خالق (creator) کے وجود سے نہیں ہے بلکہ خالق کی تخلیق (creation) کے عمل سے ہے۔ ڈارونزم کا خلاصہ یہ ہے کہ مختلف انواع جو دنیا میں دکھائی دیتی ہیں وہ الگ الگ تخلیق نہیں کی گئی ہیں بلکہ ایک ہی نوع لمبے ارتقائی عمل

کے دوران مختلف انواع میں تبدیل ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کا کوئی تعلق خدا کے وجود یا عدم وجود سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق عملِ تخلیق سے ہے نہ کہ کارسازِ تخلیق سے۔ یعنی پہلے اگر یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ہر ہر نوع کو الگ الگ پیدا کیا ہے تو اس کو ماننے کی صورت میں اب یہ عقیدہ ہو جائے گا کہ خدا نے ایک ابتدائی نوع ایسی پیدا کی جس کے اندر امکانی طور پر بے شمار انواع میں تقسیم ہونے کی صلاحیت تھی۔ اور پھر اس نے اس کے موافق کائنات میں ایک نہایت محکم فطری پراسس جاری کر دیا۔ اس طرح لمبے پراسس کے دوران ابتدائی نوع اپنے امکانات (potential) کو ظاہر کرتی ہوئی بے شمار انواع میں تبدیل ہوگئی۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ نظریۂ ارتقاء ذات خداوندی کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس بات کا مطالعہ ہے کہ خدا نے اپنی قدرت کو کس طرح عالم کائنات میں ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ خود ڈارون نے اپنی مشہور کتاب اصل الانواع (Origin of Species) کے آخر میں یہ الفاظ درج کئے ہیں۔

زندگی کے اس نقطۂ نظر میں بڑی عظمت ہے کہ اپنی مختلف طاقتوں کے ساتھ ابتداءً خالق نے زندگی کو ایک یا کئی شکلوں میں وجود دیا۔ اور اس اثنا میں جب کہ یہ سیارہ کشش ثقل کے مقرر قانون کے تحت گردش کر رہا تھا، اتنے زیادہ سادہ آغاز سے لاتعداد انتہائی خوبصورت اور عجیب صورتیں بن کر تیار ہوگئیں:

> There is grandeur in this view of life, with its several powers, having been originally breathed by the Creator into a few forms or into one; and that, whilst this planet has gone cycling on according to the fixed law of gravity, from so simple a beginning endless forms most beautiful and most wonderful have been, and are being evolved. (p. 408)

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں جو نئے علمی حقائق دریافت ہوئے ہیں انھوں نے منطق کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔ اب مذہبی استدلال اور علمی استدلال (scientific argument) کا وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو بیسویں صدی سے پہلے خلاف واقعہ طور پر فرض کر لیا گیا تھا۔ اب استدلال کے اعتبار سے سائنس کا معاملہ بھی ٹھیک اسی مقام پر پہنچ چکا ہے جو پہلے صرف مذہب کے لئے سمجھا جاتا تھا۔

نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے خصوصی طور پر نظام شمسی کا مطالعہ کیا۔ اس نے سورج کے گرد سیاروں

کی گردش کے قوانین معلوم کئے۔ اس کا یہ مطالعہ زیادہ تر آسمانی اجرام (astronomical bodies) تک محدود تھا۔ اس کو دوسرے لفظوں میں عالم کبیر (macro-world) کا مطالعہ کہہ سکتے ہیں۔ عالم کبیر میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ چیزوں کو دیکھا اور ناپا اور تولا جا سکے۔ اس بنا پر فوری تاثر کے تحت بہت سے لوگوں کا یہ ذہن بن گیا کہ حقیقت قابل مشاہدہ ہے اور صحیح اور جائز استدلال وہی ہے جو مشاہداتی دلائل پر مبنی ہو۔ اسی تصور کے تحت وہ فلسفہ بنا جس کو عام طور پر پازیٹیوزم (positivism) کہا جاتا ہے۔

مگر بیسویں صدی کے رُبع اول میں وہ حقائق دریافت ہوئے جنھوں نے مذکورہ ابتدائی نظریات کا جڑ سے خاتمہ کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالم ظاہر کے اندر زیادہ بڑے پیمانے پر ایک عالم غیر ظاہر موجود ہے۔ اس عالم غیر ظاہر کو سمجھنا یا اس پر دلیل قائم کرنا صرف بالواسطہ انداز میں ممکن ہے۔ یعنی کسی چیز کے اثرات (effects) کو دیکھ کر اس چیز کی موجودگی کا علم حاصل کرنا۔

اس انکشاف نے سارے معاملہ کو بدل دیا۔ انسانی علم کی رسائی جب تک عالم کبیر تک محدود تھی وہ مذکورہ غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ مگر جب انسانی علم کی رسائی عالم صغیر (micro-world) تک پہنچ گئی تو علمی صورتحال اپنے آپ بدل گئی۔

اب معلوم ہوا کہ براہ راست استدلال کا میدان بہت محدود ہے۔ نئے حقائق جو انسان کے علم میں آرہے تھے وہ اتنے لطیف تھے کہ صرف استنباط یا بالواسطہ استدلال ہی وہاں قابل عمل نظر آتا تھا۔ مثال کے طور پر جرمن سائنس داں رانٹجن (Whilhelm Conrad Rontgen) نے ۱۸۹۵ میں ایک تجربہ کے دوران پایا کہ اس کے سامنے کے شیشہ پر کچھ اثر (effect) ظاہر ہو رہا ہے جب کہ اس کے تجربہ اور اس شیشہ کے درمیان کوئی معلوم رشتہ موجود نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں ایک ناقابل مشاہدہ شعاع (invisible radiation) ہے جو ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ کی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔ اس کی نامعلوم نوعیت (unknown nature) کی بنا پر رانٹجن نے اس کا نام اکسرے (X-rays) رکھ دیا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (19/1058)

بیسویں صدی میں اکسریز جیسی بہت سی چیزیں دریافت ہوئیں جو براہ راست انسانی مشاہدہ میں نہیں آرہی تھیں۔ تاہم ان کے اثرات جو علم میں آئے ان کی بنا پر ان کے وجود سے انکار کرنا بھی ممکن

نہ تھا۔ ان جدید تحقیقات کے نتیجہ میں جس طرح علم کے دوسرے شعبوں میں تبدیلیاں ہوئیں، اسی طرح اس نے علم منطق میں بھی تبدیلیاں کیں۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ استنباطی استدلال کو بھی ایک معقول استدلالی معیار کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ کیوں کہ اس کے بغیر اکسریز کی تشریح نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بغیر ایٹم کے سائنسی ڈھانچہ کو ماننا ممکن نہ تھا۔ اس کے بغیر ڈارک میٹر کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں معیار استدلال میں اس توسیع کے بعد دینی معتقدات پر استدلال اتنا ہی معقول (valid) بن گیا جتنا کہ سائنسی نظریات پر استدلال۔ جس استنباطی منطق سے سائنس کے جدید دریافت شدہ نظریات ثابت کئے جا رہے تھے، عین اسی استنباطی منطق سے دینی عقائد بھی پوری طرح ثابت ہو رہے تھے۔ اس کے بعد وہ استدلالی فرق ختم ہو گیا جو پہلے دونوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔

ایک سوال کا جواب

مقالہ نگار نے آخر میں لکھا ہے کہ میں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ بہت سے ممتاز اور فکر مند ارباب علم ہیں جو اس کو ناممکن پاتے ہیں کہ وہ میرے مذہبی عقائد سے اتفاق کریں، اگرچہ وہ اس موضوع کو انتہائی سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ لے رہے ہوتے ہیں۔ اور میں اس بات کا اقرار کروں گا کہ دنیا میں اتنی زیادہ برائیاں اور اتنی زیادہ مصیبتیں اس عقیدہ کے خلاف شہادت دیتی ہیں کہ یہاں کوئی قادر مطلق خدا ہے جو اپنی مخلوقات سے محبت کرتا ہے:

> And I have to acknowledge that the existence of so much evil and suffering in the world counts against any vision of an all-powerful and loving God. (p. 7)

میں کہوں گا کہ برائی ایک اضافی لفظ ہے۔ کوئی بظاہر برائی صرف اس وقت برائی ہے جب کہ اس کی توجیہ نہ کی جا سکتی ہو۔ ڈاکٹر ایک مریض کے جسم پر نشتر چلاتا ہے۔ جج ایک مجرم کو سولی پر چڑھانے کا حکم نافذ کرتا ہے۔ بظاہر یہ ایک ظلم ہے۔ مگر ہم اس کو برا نہیں کہتے۔ کیوں۔ صرف اس لئے کہ ہمارے پاس ڈاکٹر اور جج کے فعل کی معقول توجیہ موجود ہے۔ یہی معاملہ اس برائی کا ہے جس کی طرف مقالہ نگار نے اشارہ کیا۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہاں جو برائی ہے وہ صرف انسانی معاشرہ میں ہے، ساری کائنات میں نہیں ہے۔ انسان کی محدود دنیا کو چھوڑ کر جو وسیع کائنات ہے، وہ انتہائی معیاری ہے۔ وہ مکمل طور پر نقص اور

خرابی سے پاک ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا میں کیوں برائی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کو جاننا ہوگا۔ خدا کا تخلیقی منصوبہ ہی وہ واحد کسوٹی ہے جس پر جانچ کر اس کی نوعیت کو متعین کیا جاسکتا ہے۔

خدا کا تخلیقی منصوبہ جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں انسان کو آزمائش (ٹسٹ) کے لئے رکھا گیا ہے۔ اسی آزمائش کے ریکارڈ کے مطابق ہر آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ آزمائش کی اس مصلحت ہی کی بنا پر آدمی کو یہاں آزادی دی گئی ہے۔ اگر آدمی کو آزادی نہ دی جائے تو آزمائش کی بات بالکل بے معنی ہو جائے گی۔

مذکورہ برائی دراصل اسی آزادی کی قیمت ہے۔ خدا ان انسانوں کا انتخاب کرنا چاہتا ہے جو آزادی پانے کے باوجود بااصول اور پابند زندگی (disciplined life) گزاریں۔ ایسے انسانوں کے انتخاب کے لئے بہر حال آزادی کا ماحول بنانا ہوگا۔ اگرچہ آزادی کے اس ماحول کی بنا پر کچھ لوگ ظلم بھی کریں گے۔ مگر یہ ایک ناگزیر قیمت ہے جس کو دئے بغیر وہ تخلیقی منصوبہ مکمل نہیں ہو سکتا جس سے بہتر تخلیقی منصوبہ اس دنیا کے لئے قابل تصور نہیں۔

موجودہ دنیا صرف اس وقت بے معنی دکھائی دیتی ہے جب کہ اس کو آخرت کے بغیر ایک مستقل دنیا کے طور پر دیکھا جائے۔ مگر جب ہم موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا سے ملا کر دیکھتے ہیں تو سارا معاملہ بالکل بدل جاتا ہے۔ اب وہ انتہائی بامعنی بھی ہو جاتی ہے اور انتہائی قابل قدر بھی۔

اعلان

۱۔ اگست ۱۹۹۵ کا الرسالہ "سفرنامۂ اسپین" پر مشتمل ہوگا۔ یہ سو صفحہ کا ہوگا اور اس کی قیمت فی شمارہ دس روپے ہوگی۔

۲۔ ستمبر ۱۹۹۵ کے شمارہ میں ان شاء اللہ ایک مفصل مضمون یکساں سول کوڈ کے بارہ میں شامل ہوگا۔

روحانیت کا مسئلہ

روحانیت (اسپریچولزم یا مسٹسزم) کا تصور ہزاروں سال سے دنیا میں موجود رہا ہے۔ اس کے تحت مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ان مکاتب فکر کا تفصیلی جائزہ یہاں نہیں لیا جاسکتا۔ تاہم اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ اسلام کا تصور روحانیت اس کے بالمقابل واضح ہو کر سامنے آسکے۔

اس سلسلہ میں تین بنیادی تصورات یہاں قابل ذکر ہیں۔ پہلا تصور وہ ہے جس کے مطابق روحانیت نام ہے خود اپنی اندرونی شخصیت سے ربط قائم کرنے کا۔ اس نظریہ کا کہنا ہے کہ انسان کا اندرونی وجود ایک پراسرار سمندر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم عام حالات میں وہ انسان کے لئے غیر دریافت شدہ ہوتا ہے۔ سمندر کے آئس برگ کی طرح، اس وجود کا تھوڑا سا حصہ شعور کے دائرہ میں ہوتا ہے اور اس کا زیادہ حصہ لاشعور کے دائرہ میں۔ روحانیت کا مدعا یہ ہے کہ اپنے شعور کو خود اپنے لاشعور سے مربوط کیا جائے۔ ایسا کرنے سے آدمی کو ذہنی یا روحانی ارتقاء کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہنی وجود کو شعوری طور پر مکمل کرتا ہے۔

اس نظریہ میں ایک جزئی صداقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے اپنے وجود کے امکانات اس سے زیادہ ہیں جتنا کہ عام حالت میں شعور کے ادراک میں ہوتے ہیں۔ تاہم یہ انسان کی اصل تلاش (quest) کا جواب نہیں۔ انسان اپنے شعور اور لاشعور سمیت بہرحال ایک محدود مخلوق ہے۔ اور محدود کو پانا انسان کی تلاش کا مطلوبہ جواب نہیں ہوسکتا۔

انسان کی تلاش، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، اپنی تکمیل کی تلاش ہے نہ کہ محض اپنی دریافت کی تلاش۔ انسان اپنی فطرت کی بنا پر محدودیت پر قانع نہیں ہوسکتا۔ انسان ہر اعتبار سے ایک محدود ہستی ہے۔ اب وہ لامحدود کو پانا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی محدودیت کی تلافی کرسکے۔

مذکورہ نظریہ کے تحت ساری کوشش کے بعد بھی آخر کار جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ محدود دوبارہ محدود کو پالے۔ محدود کا محدود کو پانا انسان کی تلاش کا حقیقی جواب نہیں۔

اس لئے وہ اس کو مطمئن کرنے والا بھی نہیں۔

یہ مسئلہ اصولی طور پر ادراکِ حقیقت کا مسئلہ ہے نہ کہ سادہ طور پر صرف ادراکِ ذات کا مسئلہ۔ انسان اگر خود کامل حقیقت ہوتا تو وہ کبھی تلاش کی نفسیات کا حامل نہ ہوتا۔ تلاش کی نفسیات خود انسان کے لاشعور کا حصہ ہے۔ پھر اگر لاشعور کوئی کامل وجود ہے تو وہ ہمیشہ تلاش کی نفسیات میں کیوں مبتلا رہتا ہے۔ جب کہ تلاش کی نفسیات متلاشی کے ناقص ہونے کی علامت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر خود کامل وجود ہوتا تو وہ کبھی تلاش کی فطرت لے کر پیدا نہ ہوتا۔ تمام انسان کا تلاش کی فطرت کے ساتھ پیدا ہونا اس بات کا ایک داخلی ثبوت ہے کہ انسان اپنی ذات میں کوئی کامل وجود نہیں۔ وہ یقینی طور پر ایک غیر کامل وجود ہے۔ اور یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کی روحانی تلاش کا نشانہ اس کی اپنی ذات نہیں ہو سکتا۔

روحانیت کا دوسرا نظریہ، بنیادی طور پر، وہ ہے جو فلسفۂ وحدت الوجود (monism) کے تحت پیدا ہوا۔ وحدت الوجود کا نظریہ، تفصیلات سے قطع نظر، یہ ہے کہ تمام موجودات ایک ہی اصل کے مختلف مظاہر ہیں۔ انسان اور جو کچھ انسان کے ماوراء ہے، سب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ عالم موجودات وحدت کا ظہور ہے نہ کہ تعدد کا ظہور۔ ایک فلسفی نے ہمہ اوست کے اس نظریہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

> The knower and the known are one. God and I, we are one in knowledge, and there is no distinction between us. (12/787)

اس نظریہ کے مطابق روحانیت کا مطلب، سادہ طور پر، یہ ہے کہ جزء اپنے کل کو جاننا چاہے تاکہ آخر کار وہ اس کو دریافت کر کے اس میں شامل ہو جائے۔

روحانیت کا یہ دوسرا نظریہ علمی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ اگرچہ فلسفہ اور مذہب دونوں حلقوں میں یہ نظریہ بہت زیادہ مقبول رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص یا کوئی بھی مکتب فکر ایسا نہیں جس نے اس نظریہ کے حق میں کوئی واقعی دلیل دی ہو۔

روحانیت کی تلاش کو جزء کی طرف سے کل کی تلاش بتانا موجودہ صورت میں قابل غور نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ ثابت ہونا چاہئے کہ انسان کی نوعیت فی الواقع یہی ہے

کہ وہ ایک حقیقتِ کلی کا جزء (انش) ہے۔ جب خود یہ ابتدائی بات ثابت نہ ہوئی ہو تو اس کی بنیاد پر روحانیت کی فلسفیانہ تعبیر کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے۔

ہمہ اوست کے حق میں اب تک جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں وہ یا تو صرف لفظی بیان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا اگر کسی نے کوئی دلیل دینے کی کوشش کی ہے تو وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے صرف تمثیل ہے۔ "دنیا کی تمام چیزیں ایک حقیقت کلی کا مختلف ظہور ہیں" محض ایک لفظی بیان ہے، اور کسی کا لفظی بیان کبھی دلیل کا بدل نہیں ہو سکتا۔

تمثیلی دلیل کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سمندر سے ایک قطرہ اگر نکال لیا جائے تو وہ قطرہ بھی اپنی نوعیت میں چھوٹا سمندر ہو گا۔ اسی طرح انسان حقیقت کے وسیع سمندر کا ایک چھوٹا سا قطرہ ہے۔ یہ محض ایک مثال ہے اور کوئی مثال کبھی کسی حقیقت کو ثابت نہیں کرتی۔ کسی ثابت شدہ حقیقت کی مزید تفہیم کے لئے ایک مثال دی جا سکتی ہے۔ مگر خود حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے مثال دینا سراسر غیر علمی اور غیر منطقی ہے۔

"ہمہ اوست" کے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے دو میں سے ایک دلیل لازمی طور پر ضروری ہے۔ یا تو سائنسی تحقیق سے اس کا ثبوت فراہم ہوا ہو۔ یا یہ کہ الہامی مذہب میں حقیقی طور پر اس کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ مگر یہ نظریہ نہ تو سائنس سے ثابت ہوتا اور نہ الہامی مذہب میں اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل پائی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں جو مدرسۂ فکر روحانی تلاش کو ہمہ اوست کی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے وہ بلاشبہ ایک بے بنیاد زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس نظریہ کی پشت پر نہ علم انسانی کی تصدیق موجود ہے اور نہ وحی الٰہی کی تصدیق۔

روحانی تلاش کا مطلب، اسلامی نقطۂ نظر سے، یہ ہے کہ بندہ اپنے خدا سے مربوط ہونا چاہے۔ وہ صلۃ العبد بربّہ کے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسلامی روحانیت دراصل خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی معرفت سے کسی انسان کو قلب و دماغ کی سطح پر جو چیز حاصل ہوتی ہے اسی کو اسلامی روحانیت کہا جاتا ہے۔

یہاں دوبارہ اسلامی روحانیت کے دو مدرسۂ فکر بن گئے ہیں۔ ایک کو قرآنی مدرسۂ فکر کہا

جا سکتا ہے اور دوسرا وہ جو عام طور پر تصوف کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تصوف کی بہت سی شاخیں اور بہت سی شکلیں ہیں۔ اس اختلاف و تنوع کو کسی واحد اصول کی صورت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم تصوف اپنے آخری تجزیہ میں جس چیز کا نام ہے وہ بنیادی طور پر دو ہیں ——— ایک، شیخ طریقت، دوسرے اوراد و وظائف۔ یہ دونوں چیزیں مکمل طور پر بدعت ہیں۔ کیوں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں پائی نہیں جاتی تھی۔

روحانی ترقی کے لئے شیخ کو ذریعہ بنانا یقینی طور پر کہنوت (گروڈم) کو اسلام میں داخل کرنا ہے۔ جب کہ کہنوت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو اس لئے آیا ہے کہ وہ کہنوت کی نفی کرے۔ قدیم زمانہ میں تمام مذاہب نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی پیشواؤں کو بطور واسطہ بٹھا رکھا تھا۔ اسلام نے اس درمیانی واسطہ کو ختم کیا اور اعلان کیا کہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ مگر اسلام کے ظہور کے تین سو سال بعد سابقہ جاہلی تصور کو مقدس بنا کر اسلام میں داخل کر دیا گیا۔ اس قسم کا کوئی تصور روحانی ترقی میں رکاوٹ ہے نہ کہ مددگار۔

اسی طرح اوراد و وظائف کا وہ سارا سلسلہ بدعت ہے جس کو صوفیاء نے بعد کے زمانہ میں اختیار کیا۔ جو طریقہ پیغمبر خدا نے نہ سکھایا ہو وہ کبھی معرفت الٰہی کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہر نیا طریقہ معرفت الٰہی میں رکاوٹ تو بن سکتا ہے مگر وہ اس کے لئے زینہ کا کام نہیں دے سکتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اوراد و وظائف کے مروجہ طریقے سنت رسول سے ثابت نہیں۔

مزید یہ کہ یہ تمام اوراد و وظائف جسمانی عمل ہیں اور جسمانی ورزش کبھی روحانی ترقی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ جسمانی عمل جسم کے اندر کوئی صفت پیدا کر سکتا ہے۔ مگر جسمانی عمل سے روحانی صفت پیدا ہونا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے وجود کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کا ایک ظاہری جسم ہے جو مختلف قسم کی مادی ضرورتیں رکھتا ہے۔ ان مادی چیزوں کی فراہمی کے بغیر مادی جسم کا بقاء ممکن نہیں۔ مثلاً کھانا، پانی، کپڑا، مکان وغیرہ۔ انسانی شخصیت کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس کے

اندر ایک غیر مرئی ہستی موجود ہے جس کو روح کہا جاتا ہے۔ اس روح کی بھی کچھ ضرورتیں ہیں۔ مگر یہ ضرورتیں مادی نوعیت کی نہیں ہیں۔ وہ تمام تر غیر مادی نوعیت کی ہیں۔ روح اپنی ذات میں ایک معنوی وجود ہے، اس لئے اس کی ضرورتیں بھی معنوی نوعیت کی چیزوں ہی سے پوری ہو سکتی ہیں۔

اس تقسیم کے مطابق، انسان چوں کہ دوہرا شخصیت کا مالک ہے، اس لئے انسان کو زندہ رہنے کے لئے دو قسم کے رزق کی مسلسل فراہمی درکار ہے۔ ایک وہ جس کو رزق جسمانی کہا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کو رزق روحانی کہہ سکتے ہیں۔ رزق جسمانی کے حصول کا مرکز، قرآن کے مطابق، موجودہ زمین ہے (ابراہیم ۳۲) اور رزق روحانی کے حصول کا مرکز ذات خداوندی ہے۔ اسی لئے قرآن میں اس دوسرے رزق کو رزق رب (طٰہٰ ۱۲۱) یا رزق حسن (ہود ۲۸) کہا گیا ہے۔

رزق روحانی دراصل خارجی سرچشمہ رزق سے اتصال کا نتیجہ ہے۔ یہ مقصد تمام تر ذہنی عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس ذہنی عمل کو قرآن میں تذکر اور تفکر کہا گیا ہے۔ آدمی جب اپنے ذہن کو عالم خارجی سے ہٹا کر عالم باطنی کی طرف لے جاتا ہے، جب وہ اشیاء کے مادی پہلو سے اوپر اٹھ کر ان کے معنوی پہلو پر اپنی سوچ کو مرتکز کرتا ہے تو اس وقت انسان ایک نئی دنیا سے متعارف ہوتا ہے۔ وہ نئی لطیف تر حقیقتوں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی معرفت کو بڑھاتا ہے اور اس طرح اس کو وہ رزق عطا کرتا ہے جس کے اوپر وہ جی سکے۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو کسی حد پر ٹھہرنا نہیں جانتا۔ حد پر ٹھہرنا آدمی کے لئے ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔ کسی آدمی کا حد پر ٹھہر جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ رزق روحانی سے محروم ہو گیا۔ کیوں کہ جس آدمی کو رزق روحانی سے حصہ مل رہا ہو، اس کا فکری ارتقاء مسلسل جاری رہے گا۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں ایک اجتماع ہوا۔ یہاں میری تقریر ہوئی۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوا۔

میں نے کہا کہ اس ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اکثر مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس دنیا میں ہمیشہ مسائل رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ آپ امریکہ چھوڑ کر مکہ مدینہ چلے جائیں تو وہاں بھی آپ دیکھیں گے کہ مسائل موجود ہیں۔ اس لئے اصل مسئلہ مسئلہ کا ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسئلہ کا سامنا کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہ ہو۔ آپ کو چاہئے کہ مسئلہ کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے اس کے بارہ میں سوچیں اور اپنے جوابی عمل کا نقشہ بنائیں۔

آرنج کاؤنٹی رجسٹر (۳۰ دسمبر) میں رائٹر کے حوالے سے ایک خبر تھی۔ اس نے سرخیل (افغانستان) سے یہ رپورٹ بھیجی تھی کہ تغب وادی میں حریف افغانی گروہوں کے درمیان سخت لڑائیاں (fierce battles) جاری ہیں۔ یہ علاقہ کابل کے مشرق میں واقع ہے۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں دس ہزار سے زیادہ افغانی اپنے وطن کو چھوڑ کر بھاگے ہیں۔ ریڈ کراس نے ان کے قیام کا انتظام عارضی کیمپوں میں کیا ہے۔ یہ لڑائی دو مہینہ سے جاری ہے۔ اس خبر کی سرخی یہ تھی:

10,000 flee fierce Afghan factional strife.

سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد افغانی اس طرح کیوں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی ہی ان کا طریق زندگی ہے۔ گن کلچر کے سوا کسی اور کلچر کو وہ جانتے ہی نہیں۔ افغانیوں کی اصل ضرورت ہتھیاروں کی سپلائی نہیں ہے۔ ان کی اصل ضرورت یہ ہے کہ ان کو تعمیری سوچ دی جائے۔ ان کو تعلیم کی طرف موڑا جائے۔ ان کو بتایا جائے کہ عزت اور ترقی کا راز گولی میں نہیں ہے بلکہ علم میں ہے۔

ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ دور اول کے مسلمانوں کے لئے ہر طرف کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ آج وہ شکایت کرتے ہیں کہ ہر طرف کے دروازے ان کے لئے بند ہیں۔ پہلے ہر جگہ ان کو حمایت مل رہی تھی، آج ہر جگہ ان کو مخالفت سے سابقہ پیش آرہا ہے۔ اس کی وجہ دونوں زمانوں کے مسلمانوں کا ذہنی فرق ہے۔ دور اول کے مسلمان دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہتے تھے کہ ہر انسان مسٹر نیچر ہے۔ آج کے مسلمانوں کا ذہن اس کے

برعکس یہ ہے کہ ہر انسان مسٹر دشمن ہے۔ اس تصور نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سلوک دوسرے لوگوں سے غیر اسلامی بنا دیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے تمام معاملات بگڑ کر رہ گئے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: آپ ایڈجسٹمنٹ کا جو نظریہ پیش کرتے ہیں اس کو انڈیا میں کتنے لوگ مانتے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا ہی میں نہیں ساری دنیا کے تمام مسلمان میرے ہم خیال ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیسے۔ میں نے کہا کہ ذاتی مسائل میں ہر آدمی ایڈجسٹمنٹ ہی کے اصول پر زندگی گزار رہا ہے۔ حتی کہ آپ خود بھی۔ کوئی آدمی اگر ایڈجسٹمنٹ نہ کرے تو زندگی گزارنا ہی اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ ڈبل اسٹنڈرڈ بنے ہوئے ہیں۔ ذاتی معاملات میں وہ ایڈجسٹمنٹ کے اصول پر چلتے ہیں اور جب ملت کے موضوع پر لکھنا یا بولنا ہو تو وہ فوراً ٹکراؤ کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

ایک بار میں صغیر اسلم صاحب کے کمرہ میں داخل ہوا۔ وہ قرآن ہاتھ میں لئے ہوئے اس کو پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن فہمی کی کنجی کیا ہے۔ اس کی ایک ہی کنجی ہے اور وہ ہے ابن تیمیہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنا کہ یامعلم ابراھیم علمنی میں نے کہا کہ قرآن واحد کتاب ہے جس کے مصنف سے آپ ہر وقت کنسلٹ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ مصنف قرآن کے ساتھ آپ کے ربط کا یقینی ذریعہ یہی دعا ہے۔

۲۹ دسمبر کی شام کو مسٹر صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کا درس دیا۔ ان احادیث کا تعلق اسلام کی روح اور اس کی بنیادی اسپرٹ سے تھا۔ ڈاکٹر سلمان ندوی بھی اس اجتماع میں موجود تھے۔ انھوں نے ساؤتھ افریقہ کے مسلمانوں کے دینی حالات بتائے، جو بہت سبق آموز تھے۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ غیر قوموں کے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ مسلم امت کی بڑی مایوس کن تصویر ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ ظلم کو میں چیلنج کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس لئے جس چیز سے لوگ مایوسی کا تاثر لے رہے ہیں اس میں مجھے امید کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالی جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف مصیبتوں کو اس طرح بھیج دیتا ہے جیسے ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔ میں مسلمانوں کے موجودہ معاملہ کو اسی حدیث کے ذیل میں شمار کرتا ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور آرنلڈ ٹوائن بی نے اس کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ وہی قوم ترقی کرتی ہے جو دباؤ کے حالات سے دوچار ہو۔ دباؤ کے حالات ہمیشہ قوموں کو ابھارنے کا سبب بنتے ہیں۔ جیسے کہ صلیبی جنگوں میں مسیحی قوموں کی شکست نے انھیں دوبارہ زیادہ طاقت ور بنا کر اٹھایا۔ یہی معاملہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ یہ چیلنج انشاء اللہ مسلمانوں کے لئے احیاء نو کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اس اجتماع میں خواتین اور بچے بھی شریک تھے۔ ان کی طرف سے بہت سے سوالات کئے گئے۔ ایک بچے نے انگریزی میں یہ سوال لکھ کر دیا:

Why did the Kuffar not like Prophet Muhammad?

میں نے کہا کہ اس لئے کہ پیغمبر اسلام ان کی خواہش کے خلاف بولتے تھے۔ آج بھی کسی کے خلاف بولا جائے تو وہ بھی آپ کا اسی طرح مخالف ہو جائے گا جس طرح وہ لوگ مخالف بن گئے۔

امریکہ کی تاریخ کے بارہ میں ایک کتاب دیکھی۔ یہ کتاب ۱۹۸۹ میں چھپی تھی اور وہ ۹۵۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کا نام تھا:

The Story of America, by John A. Garraty.

اس کو پڑھتے ہوئے ایک مقام پر نظر سے گزرا کہ ۵ اکتوبر ۱۹۷۳ کو جب کہ یہودیوں کا مقدس دن تھا، مصر اور شام نے دوبارہ اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اسی دوران اوپیک نے جو عربوں کے کنٹرول میں تھی، امریکہ، جاپان، مغربی یورپ کو اس انتقام میں تیل کی سپلائی بند کر دی کہ انھوں نے اسرائیل کی مدد کی تھی۔ اس کا اثر امریکی صارفین پر نہایت گہرا پڑا۔ گیسولین پر راشن لگ گیا۔ سارے امریکہ میں گیس پمپ پر کار کی لمبی لمبی لائن لگنے لگی۔ عربوں کے پیدا کردہ تیل کے اس بحران نے امریکیوں کو بتایا کہ یہ پابندی جاری رہی تو بیشتر عوام کی اقتصادیات اور طرز زندگی خطرہ میں پڑ جائیگی:

This Arab oil crisis caused Americans to realize that an extended ban would threaten the economy and life style of most people. (p. 863)

قدیم زمانہ میں افسانوی شہزادہ کی جان کسی طوطے میں ہوتی تھی جو کسی دور کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔ "ترقی یافتہ امریکہ" کی جان دوبارہ عربوں کی سرزمین میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ قدیم شہزادہ کے طوطے کا پنجرہ اس کے اپنے قبضہ میں نہیں ہوتا تھا۔ مگر آج کے امریکہ نے عرب ورلڈ کو پوری طرح اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔

میں ایک مسلم لائبریری کے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوں۔ سامنے کی میز پر مختلف قسم کے پرچے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو یہاں کے مسلمان نکالتے ہیں۔ کچھ ٹائٹل یہ ہیں:

Muslim World Monitor
American Muslim
Bosnia News Letter
The Minaret
The Pakistan Link
Muslim Journal

اس قسم کے بہت سے پرچے تھے۔ مگر ان کے مندرجات میں احتجاجی پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً یہ کہ کلنٹن نے واشنگٹن میں سلمان رشدی سے ملاقات کرکے اسلام اور مسلمانوں کی انسلٹ کی ہے۔ مغرب کی تخریبی پالیسیوں کا نشانہ یہ ہے کہ اسلامی احیاء کی تحریکوں کو کچل دیا جائے، وغیرہ:

Clinton's insult to Islam.

West's disruptive policies aimed at undermining the revival of Islam

میز پر جتنے بھی مسلم پرچے تھے سب میں احتجاجی پہلو غالب تھا۔ اگر ان سب کا مشترک نام پروٹسٹ رکھ دیا جائے تو وہ غلط نہ ہوگا۔ انھیں کے درمیان ایک اور ہفت روزہ تھا۔ اس کا نام تھا ___ (L.A. India Journal) یہ ہفت روزہ ایک ہندو تنظیم نکالتی ہے۔ اس کا انداز بڑی حد تک مختلف تھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ہندوؤں کے پرچے زیادہ معیاری اور زیادہ کامیاب ہیں۔ عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بھی ہندو اور مسلمان کا فرق باقی ہے۔ حالاں کہ تعداد کے اعتبار سے دونوں تقریباً یکساں ہیں۔ یعنی ہر ایک چھ ملین۔

۲۹ دسمبر کی شام کو جناب عبداللطیف صاحب کے مکان پر کھانا تھا۔ یہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ جناب عبدالوہاب صاحب نے انڈسٹری کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔ ایک

بات انھوں نے یہ بتائی کہ جاپان امریکہ سے بہت بڑی مقدار میں لوہے کے ٹکڑے (scraps) خریدتا ہے۔ یہ ٹکڑے بڑے بڑے جہازوں میں لد کر یہاں سے جاپان جاتے ہیں۔ ان جہازوں میں کارخانے بھی لگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمندر کے اندر دوران سفر ہی میں ان ٹکڑوں کو چادر میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ اس سے انھیں ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سفر کا وقت مزید استعمال ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی چادروں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ ان کو سمندر میں مفت کا پانی وافر مقدار میں مل جاتا ہے جس سے وہ بنی ہوئی انتہائی گرم چادروں کو ٹھنڈا کر سکیں۔ یہ ہے ایک کام کے دوران دوسرا کام کرنا۔

یہاں جو لوگ تھے ان میں سے ایک مسٹر شبیر دادا بھائی تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کے خلاف ہر جگہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کو فنا کرنے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ مسٹر دادا بھائی نے کہا: پھر ہم نے کیا گھاس کھا رکھی ہے۔ آخر ہماری سمجھ کہاں چلی گئی ہے۔ وہ اکسپلائٹ کرنا چاہتے ہیں تو ہم اکسپلائٹ کیوں ہو جاتے ہیں۔ وہ سازش کرتے ہیں تو ہم ان کی سازش کا شکار کیوں ہوتے ہیں۔

مسٹر اعظم سجاد قریشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مینجمنٹ کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جدید مینجمنٹ میں لگاتار ترقی (continuous improvement) کا اصول ہے۔ جاپان کی ترقی اسی اصول کو اختیار کر کے ہو رہی ہے۔ وہ لوگ مسلسل سوچتے رہتے ہیں کہ مزید ہم کیا نئی بات نکالیں۔ ہم اور کون سی بہتری پیدا کریں۔ اس طرح ان کا نظام برابر آگے بڑھتا جا رہا ہے۔

لگاتار ترقی کا یہی اصول دین میں بھی ہے۔ مومن کا ایمان ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ وہ اللہ کے ذکر، قرآن و حدیث کے مطالعہ، کائنات خداوندی میں غور و فکر سے ربانی غذائیں لے کر برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اضافہ کا یہ عمل مومن کی شخصیت میں موت کے آخری لمحہ تک جاری رہتا ہے۔

ایک موقع پر میں نے بخاری کی یہ حدیث سنائی کہ ایک دیہاتی شخص مدینہ آیا۔ اس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا۔ صحابہ اس کو مارنے کے لئے دوڑے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔ اور پیشاب کی جگہ پر پانی بہا دو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے اٹھائے گئے ہو، مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں اٹھائے گئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں اگر کوئی شخص پیشاب کر دے یا اور کوئی گندگی ڈال دے۔ مثلاً وہ خنزیر کو مسجد میں ڈال دے۔ یا ہولی کا رنگ پھینک دے تو ایسی حالت میں مسلمان کو کیا کرنا چاہئے۔ مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس کو مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ وہ اس کو مسجد کی صفائی کا مسئلہ بنائیں۔ اس طرح کے کسی واقعہ کو اگر مسجد کی بے حرمتی کا سوال بنا دیا جائے تو اس سے فساد برپا ہوتا ہے اور اگر اس کو مسجد کی صفائی کا سوال بنا یا جائے تو ایک ڈول پانی پر معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک صورت میں خون بہائے جاتے ہیں اور دوسری صورت میں پانی کو بہانا کافی ہو جاتا ہے۔

آسانی پیدا کرنے والے اور مشکل پیدا کرنے والے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ اس کو گھٹانے والے بنیں، وہ اس کو بڑھانے والے نہ بنیں۔ یہ بھی ایک سنت رسول ہے۔ آجکل اگر کسی سے پوچھیں کہ سنت کیا ہے تو وہ کہے گا کہ داڑھی میں خضاب لگانا، سر پر عمامہ باندھنا۔ مسواک کرنا وغیرہ۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ بھی ایک عظیم سنت ہے کہ کوئی شخص اگر مسجد جیسی مقدس جگہ پر گندگی ڈال دے تو آپ مشتعل نہ ہوں۔ آپ معاملہ کو مزید نہ بڑھائیں۔ بلکہ جس مقام پر مسئلہ پیدا ہوا ہے وہیں دھو کر اسے ختم کر دیں۔

امریکی مسلمانوں کی ایک تنظیم کے ایک عہدیدار نے اپنے یہاں کا چھپا ہوا پمفلٹ مجھے دیا۔ یہ اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں تھا۔ اس میں بابری مسجد کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

The Babari Masjid at Ayodhya was demolished on December 6, 1992 by a frenzied mob of thousands of militant Hindus.

یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں نے مختلف الفاظ میں یہی بات لکھ رکھی ہے۔ مگر اس کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو جس طرح انھوں نے لکھا ہے اسی طرح خدا کے فرشتوں نے بھی اس کو یقینی طور پر لکھ رکھا ہے۔ اور مسلم دانشوروں کی اس تحریر کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ فرشتوں کے اندراج کے مطابق ہو۔ مجھے سخت شبہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ فرشتوں کے رجسٹر میں غالباً اس واقعہ کی بابت برعکس طور پر یہ الفاظ لکھے گئے ہوں گے:

Incompentent Muslim leaders of India turned Hindus into a frenzied mob and they demolished the Babari Masjid at Ayodhya on December 6, 1992.

سان فرانسسکو سے ڈاکٹر منظور غوری نے ٹیلیفون کیا اور اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے مطابق ۳۱ دسمبر کو ایک ملکی سفر ہوا۔ صبح کو جناب یونس سیجی کے ساتھ گارڈن گروو سے ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ یونس سیجی صاحب گجراتی ہیں۔ حسب عادت راستہ میں ان سے سوال کرکے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ ہر آدمی سے اس کے میدان کی بات کرتا ہوں۔ اور اس طرح معلومات میں اضافہ کرتا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ گجرات میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ دینداری ہے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ بتائی کہ گجراتی لوگ علماء کرام سے بہت زیادہ عقیدت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بچپن سے بتایا جاتا ہے کہ علماء کرام وارث انبیاء ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ گجراتیوں کے جو ادارے ہیں، ان میں آپس میں جھگڑا بہت کم ہوتا ہے۔ مقابلۃً ان میں زیادہ اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں بھی گجراتیوں کا مزاج ہی اس کا سبب ہے۔ گجراتیوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ادارہ میں ۵۰۰ روپیہ دے کر الگ ہو جائے گا۔ مگر وہ پانچ پیسہ خود اس سے لینے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس طرح بات کرتے ہوئے مقامی ایئرپورٹ پہنچا۔ یہ ایئرپورٹ چھوٹا مگر نہایت منظم تھا۔ امریکن ایئرلائنز کی فلائٹ ۱۶۱۲ کے ذریعہ سین جوزے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ ایک گھنٹہ کی پرواز تھی۔

جہاز کے اندر امریکن ایئرلائنز کا میگزین (American Way) دیکھا۔ اس میں ایک امریکی سائنس داں (Hans Christian Von Baeyer) کی کتاب (The Fermi Solution) کا ایک باب نقل کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کا تقریباً ۹۰ فیصد حصہ ناقابل مشاہدہ مادہ (invisible material) پر مشتمل ہے۔ اس کو عام طور پر تاریک مادہ (dark matter) کہا جاتا ہے۔ اس کو براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کو بالواسطہ دیکھنے کا ایک طریقہ موجود ہے:

but there is an indirect way of detecting it.

یہ بالواسطہ طریقہ یہ ہے کہ ان ناقابل مشاہدہ اجرام سماوی کا رنگ اسپکٹرم پر بدلتا ہوا دکھائی

دیتا ہے:

their colors shift toward the red end of the spectrum. (p. 44)

سائنس چار سو سال سے پُر اسراریت کی کہر کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو کہ تاریک ادوار میں دنیا کو گھیرے ہوئی تھی۔ اس کوشش میں سائنس نے نہ صرف علم کے کچھ جزیروں کو دریافت کیا ہے بلکہ بے علمی کے وسیع سمندر سے بھی آدمی کو واقف کرایا ہے:

Science, in clearing away the fog of myth and mysticism that shrouded the world in the Dark Ages, has exposed not only sharply delineated islands of knowledge but also boundless seas of ignorance. (p. 47)

۲۹ دسمبر کی سہ پہر کو جہاز سین جوزے ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ یہاں ڈاکٹر جہاں گیر عالم موجود تھے۔ ان کے ساتھ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ پورا علاقہ نہایت صاف ستھرا ہے۔ اس کو عام طور پر (Bay Area) کہا جاتا ہے۔ پہلے ہم لوگ پالو آلٹو (Palo Alto) گئے۔ یہاں جناب منظور غوری صاحب کے مکان پر کچھ دیر قیام رہا۔ پالو آلٹو عالمی تجارت کا مرکز ہے اور بہت زیادہ مہنگا علاقہ ہے۔

منظور غوری صاحب علی گڑھ سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ نے ہجرت سے اپنا مسئلہ حل کیا ہے۔ ہمیں بھی ہجرت ہی سے اپنا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔ اگرچہ دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آپ لوگوں نے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت کی ہے۔ ہم کو ایک طریق کار سے دوسرے طریق کار کی طرف ہجرت کرنا ہوگا۔ اب تک ہندستانی مسلمان احتجاجی طریق کار پر چل رہے تھے، اب انھیں صابرانہ طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔

۲۹ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ منظور غوری صاحب کے ساتھ فری مانٹ (Fremont) گیا۔ وہاں کی زیر تعمیر مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد ایک مکان خرید کر بنائی جا رہی ہے۔ یہاں مختلف لوگوں سے انفرادی انداز میں گفت گو ہوئی۔ منظور غوری صاحب ہندستان کے مسلمانوں میں تعلیم کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک کالج چلانے کے لئے دس ہائی اسکول چاہئے۔ ایک ہائی اسکول کے لئے پانچ ایلمنٹری ایجوکیشن کا ادارہ چاہئے۔ نیچے کی تعلیم جب تک مضبوط نہیں ہوگی اوپر کی تعلیم مضبوط نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو ہم نے یونیورسٹی بنائی تھی۔ اب ہمارا فوکس یہ ہونا چاہئے کہ ایلمنٹری اسکول بنائیں۔ وہ ہندستان کے دیہات میں تعلیم کو پھیلانا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر قسم کا

Muslim Community Association

(Santa Clara, CA)

Invites you to a talk by

Maulana Waheed-ud-Deen Khan
President, Islamic Center, New Delhi, India
Leading Muslim Intellectual and Author of Many Books including the Famous "Ilm Jadeed ka Challenge"

Titled

The Modernists' Attack on Islam: Historical Prospective and Response

Place: Masjid Annoor, Santa Clara
Time: 7:45PM (after salat Al-Isha)
Date: Friday, December 30, 1993

تعاون دینے کے لئے تیار ہیں۔

۳۱ دسمبر کو پالو آلٹو (Palo Alto) میں ڈاکٹر مرغوب احمد قریشی (پیدائش ۱۹۳۱) سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۹۱ میں انھوں نے ایک مسلم تحقیقی ادارہ (Muslim think tank) بنایا ہے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے اپنا کچھ لٹریچر بھی پڑھنے کے لئے دیا۔

ان کا خیال ہے کہ مغربی قوموں کا عالمی غلبہ اس طرح ممکن ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے اعلیٰ دماغوں کا تھنک ٹینک بنایا۔ یہ لوگ عالمی ریسرچ کے ذریعہ اسٹریٹجی طے کرتے ہیں۔ ان پر عمل کرکے کہیں جنگ کرائی جاتی ہے۔ کہیں کسی کو گرایا اور کسی کو اٹھایا جاتا ہے۔ میڈیا کے ذریعہ لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ ڈاکٹر قریشی اور ان کے ساتھیوں نے ریسرچ کرکے مسلم امت کے لئے ایک طریق کار طے کیا ہے۔ یہ طریق کار اسی مغربی نمونہ پر ہے۔ مثلاً مختلف مغربی ملکوں میں لابی گروپ بنانا، ناٹو کی مانند مسلم ملکوں کا مشترک دفاعی ٹاسک فورس تیار کرنا، مسلمانوں کا آزاد سنٹرل بینک بنانا، مسلم ملکوں کے درمیان کامن مارکٹ اور کامن کرنسی قائم کرنا، مسلم ملکوں کے باہمی تعاون سے ملٹری ہارڈ ویر تیار کرنا تاکہ مستحکم دفاع کیا جاسکے۔ مسلم دنیا کے نزاعات کے تصفیہ کے لئے ایک انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس وضع کرنا۔

Will Muslims, living in the United States, Europe and the rest of the world, be facing economic and political crisis in the next 10-15 years and what resources they must develop to meet those crisis? Some potential policy options regarding these questions and above scenarios which the scholars may consider are:

1. The formation of strong lobby groups in the United States, U.K., France, Germany, and Russia to influence the media and counter the influence of anti-Islam lobbies.

2. The formation of a collective defensive task force by Muslim countries similar to NATO.

3. The formation of a central independent Muslim bank for international settlements for banking transactions between Muslim countries similar to the Bank for International Settlements (BIS) in Switzerland.

3. The formation of an independent organization of Muslim countries similar to the General Agreement on Trade and Tariffs (GATT), as a preamble to establish: (a) a Muslim Common Market with preferential treatment or free flow of goods between the Muslim world, (b) common currency or a monetary unit.

4. The establishment of an international court of justice for the Muslim world to settle inter-country disputes.

5. Forging close collaboration between relatively advanced Muslim countries to develop and manufacture military hardware for the collective defense of the Muslim world as well as to provide a balance of power between future power blocks.

مذکورہ مسلم تھنک ٹینک نے اپنا یہ نقشۂ عمل مغربی قوموں کا مطالعہ کرکے انھیں کے نمونہ پر تیار کیا ہے۔ مگر موجودہ حالات میں یہ نہ صرف ناممکن ہے، بلکہ وہ مسلم مسائل کا حل بھی نہیں۔ مسلمانوں کے لئے صرف دو نکاتی پروگرام یہ ہے کہ داخلی اعتبار سے تعلیم اور خارجی اعتبار سے دعوت۔ یہ پروگرام پوری طرح قابل عمل ہے اور وہی سنت رسول کے مطابق ہے۔ پروگرام کسی خیالی نقشہ کا نام نہیں۔ حقیقی پروگرام وہ ہے جس کو زیر عمل لانا فوری طور پر ممکن ہو اور نتائج کے اعتبار سے وہ دوررس ثابت ہونے والا ہو۔

واپسی میں جہاز کے اندر امریکن ایئرلائنز کا میگزین امریکن وے (یکم جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس میں مضامین کم اور اشتہارات زیادہ تھے۔ امریکہ میں گفت وشنید (negotiating programs) کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے ادارے صرف اس کام کے لئے قائم ہیں اور ضرورتمند لوگ بڑی بڑی قیمت دے کر ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک بڑی امریکی کمپنی کا اشتہار میگزین میں چھپا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ گفت وشنید آپ کا سب سے زیادہ طاقت ور تجارتی آلہ (business tool) ہے۔ مؤثر بات چیت (effective negotiating) کی تفصیلات دیتے ہوئے اس میں درج تھا کہ :

> In business, you don't get what you deserve,
> you get what you negotiate.

اس کو پڑھ کر میں نے سوچا کہ یہی معاملہ زندگی کا بھی ہے۔ ایک آدمی امکانی طور پر ایک چیز کا مستحق ہو سکتا ہے۔ مگر امکانی استحقاق کو واقعہ بنانے کے لئے اپنی قوت کلام کو پرامن طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کی صورت میں آدمی کو بہت بڑی طاقت دیدی ہے۔ مگر نادان آدمی معنوی حقیقتوں سے بے خبر ہونے کی بنا پر گولی کو سب سے بڑی چیز سمجھ لیتا ہے۔

بے ایریا سے واپس ہو کر دوبارہ میں آرنج کاونٹی آگیا۔ یہاں روزنامہ آرنج کاونٹی رجسٹر (یکم جنوری ۱۹۹۴) میں ایڈورڈ گارگن (Edward A. Gargan) کے قلم سے ایک رپورٹ چھپی تھی اس کا عنوان تھا :

In India, good dowry is key to a decent marriage.

اس میں بتایا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی نے آزادی سے پہلے جہیز کی رسم کی سخت مذمت کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جو آدمی جہیز طلب کرے اس کو برادری سے خارج کر دیا جانا چاہئے۔ اس کے بعد جب ہندستان آزاد ہوا تو نئی ہندستانی گورنمنٹ نے ممانعت جہیز کا قانون (Dowry Prohibition Act) پاس کیا۔ لیکن آج بھی اضافہ کے ساتھ جہیز کا مذموم طریقہ رائج ہے۔ امیر اور غریب، منسٹر اور کلرک، قانون داں اور انجنیر تک ہر ایک اس رسم میں مبتلا ہے۔

یہاں ایک صاحب نے بڑے جوش سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندستان میں آپ لوگوں کو مسلم قانون دانوں کا ایک بورڈ بنانا چاہئے جس کا کام لیگل فائٹنگ ہو۔ وہ مسلمانوں کے خلاف قوانین کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے اور مسلم موافق قوانین پارلیمنٹ سے بنوائے۔ میں نے ان کو مذکورہ اخباری رپورٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ جہیز کو مہاتما گاندھی نے کنڈم کیا۔ تمام اخباروں نے اس کے خلاف آرٹیکل شائع کئے۔ اور اس کے خلاف باقاعدہ ایک قانون بھی بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود ہندستانی سماج سے ایک فیصد بھی جہیز ختم نہ ہوسکا۔ پھر آپ کس بنا پر یقین کرتے ہیں کہ قانونی دفعات کے ذریعہ ہندستانی مسلمانوں کا تحفظ ہو جائے گا۔

کیلی فورنیا سے نکلنے والے مسلم میگزین (Our Times) کے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۹۳ میں سابق مرکزی وزیر مسٹر اندر کمار گجرال کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں مسٹر گجرال کے اس قول کو سرخی بنایا گیا تھا کہ انڈیا دنیا میں دوسرا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے:

India is the 2nd largest Islamic country in the world.

اس کو پڑھتے ہوئے میں نے سوچا کہ ۱۹۴۷ میں تقسیم کی قیادتی حماقت کے باوجود انڈیا میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہمارے لئے ایک عظیم امکان تھا۔ مگر بدقسمتی سے تقسیم کے بعد دوبارہ نااہل مسلم قائدین کی فوج اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے امکانات کو استعمال کرنے کے بجائے مسلمانوں کو صرف مسائل میں الجھا دیا۔ اگر یہ دوسری نادانی نہ کی گئی ہوتی تو اب تک انڈیا کے مسلمان عالمی نقشہ پر نمبر ایک ملک کی حیثیت حاصل کر چکے ہوتے۔ مگر قائدین کی ناقابل بیان حماقتوں کے نتیجہ میں انڈیا کے مسلمان صرف ایک غیر اہم اقلیت بن کر رہ گئے۔

نیویارک کے مسلم اخبار منارہ (The Minaret) کے شمارہ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ میں بتایا گیا تھا کہ کراچی میں تعلیم کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا۔ اس میں پاکستان کی ایجوکیشن منسٹری کی طرف سے ایک پیپر پیش کیا گیا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کم تعلیم والے ۱۲۱ ملکوں میں پاکستان ۱۱۱ ویں نمبر پر ہے:

Pakistan occupies 111th position among 121 countries with the lowest literacy rates.

پاکستان بننے کے بعد وہاں درجنوں "مفکرین اسلام" اٹھے جن کا نعرہ تھا پاکستان میں مکمل اسلامی نظام کا نفاذ تاکہ خلافت ارضی اور قیادت عالم کا مقام پاکستان کو مل سکے۔ یہ سراسر ایک لغو نعرہ تھا۔ اور اس کی لغویت کا ثبوت یہ ہے کہ پچاس سالہ ہنگامہ آرائی کے باوجود اس کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان تمام اشخاص کے کرنے کا واحد کام یہ تھا کہ وہ پاکستان کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کرتے۔ اگر یہ تمام لوگ تعلیم کے میدان میں محنت کرتے تو آج یقینی طور پر پاکستان صد فی صد تعلیم یافتہ ہو چکا ہوتا اور اس کے بعد اس کے لئے ہر مقصد کو حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔

یکم جنوری ۱۹۹۴ کی شام کو یہاں کچھ کشمیری لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے کس لئے امریکہ کا سفر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کشمیری اشو کو انٹرنیشنلائز کرنے کے امریکہ آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ مومن ایک بل سے دوبارہ ڈسا نہیں جاتا، اور آپ لوگ بار بار کے ناکام تجربہ کے باوجود پھر اسی بل پر اپنا ہاتھ ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کا کیا مطلب۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات کبھی انٹرنیشنلائزیشن سے حل نہیں ہوتے۔ سلطان ٹیپو نے دو سو سال پہلے انگریزی استعمار کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ پھر علما نے ریشمی رومال تحریک کی صورت میں آزادیٔ ہند کے مسئلہ کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ بھی بے سود ثابت ہوا۔ پھر مسلمانوں نے فلسطین اور بوسنیا کے مسائل کو انٹرنیشنلائز کیا مگر وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح بابری مسجد کے مقامی اشو کو نیشنلائز اور پھر انٹرنیشنلائز کیا گیا مگر بابری مسجد کو بچایا نہ جا سکا۔ پھر اب آپ کس بنا پر اس قسم کی تدبیر کے ذریعہ کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے کہا کہ کشمیر میں آپ اپنے ناپختہ نوجوانوں کو ایک ریگولر آرمی سے لڑوا رہے ہیں۔

آخر اس نامساوی ٹکراؤ سے آپ کس طرح فتح کی امید قائم کئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ میں نے کہا کہ اقبال تو ایک شاعر تھے۔ اور قرآن کے مطابق، شاعر کبھی ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ چنانچہ جس اقبال نے لڑا دے ممولے کو شہباز سے کہا تھا، اسی اقبال نے یہ بھی کہا ہے کہ:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر　　تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جنگ بدر میں صرف ۳۱۳ مسلمان تھے اور وہ ایک ہزار طاقت ور فوج پر غالب آئے۔ میں نے کہا کہ جنگ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے پیشگی یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اس میں فرشتے مدد کے لئے اتارے جائیں گے اور وہ مسلمانوں کے حق میں کامیابی کی ضمانت ہوں گے۔ کیا آپ لوگوں کے پاس بھی اس قسم کی کوئی وحی آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر انھوں نے کہا کہ جواہر لال نہرو کی یقین دہانی اور اقوام متحدہ کا رزولیوشن ریفرنڈم کے حق میں موجود ہے۔ پھر انڈیا کیوں نہیں اس مسئلہ پر ریفرنڈم کرواتا۔ میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات محض ایک پرنسپل کی بات ہے اور متشددانہ جنگ میں لفظی پرنسپل کا حوالہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ پرنسپل پرامن لڑائی میں طاقت کا کام کر سکتا ہے مگر متشددانہ لڑائی میں وہ ہرگز کسی کے لئے کوئی طاقت نہیں۔

انھوں نے کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انڈیا ہمارے اوپر کتنا زیادہ ظلم کر رہا ہے۔ اس نے ہمارے عزت داروں کو بے عزت کیا۔ اس نے کشمیری سماج کو تباہ کر دیا۔ میں نے کہا کہ قرآن میں حکم ہے کہ دشمنی میں بے انصاف نہ بن جاؤ بلکہ ہمیشہ انصاف کی بات کہو۔ آپ جس ظلم کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ۱۹۸۹ کے بعد پیش آیا ہے جب کہ آپ نے سری نگر کی سرکاری عمارتوں پر بم مارا اور اس طرح تشدد اور جوابی تشدد کی سیاست کشمیر میں چلائی۔ ۱۹۸۹ سے پہلے انڈیا کی فوج کشمیر میں تھی مگر اس نے کبھی بھی کشمیری آبادیوں پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ قرآن میں ملکہ سبا کے قصہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ جب تم بادشاہوں کے خلاف جنگی اقدام کرو گے تو وہ تمہاری بستیوں میں داخل ہو کر فساد کریں گے اور عزت داروں کو بے عزت کریں گے۔ اس لئے تم بادشاہوں کے خلاف اس قسم کا اقدام

کرنے سے پرہیز کرو۔ جب آپ نے تشددانہ اقدام کر دیا تو اس کے بعد آپ کو اس شکایت کا حق باقی نہیں رہتا کہ فریق ثانی آپ کے خلاف تشدد کی کارروائی کر رہا ہے۔

پھر انھوں نے افغانستان کی مثال دی۔ انھوں نے کہا کہ افغانی مجاہدین ایک سپر پاور سے لڑے اور کامیاب ہوئے۔ اسی طرح کشمیری مجاہدین بھی اپنی لڑائی میں کامیاب رہیں گے۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ افغانستان کی جنگ میں ایک اور سپر پاور کھلم کھلا پوری طرح افغانیوں کے ساتھ تھا۔ آپ کی موجودہ جنگ میں کس پاور یا سپر پاور کی حمایت اس طرح آپ کو حاصل ہے۔ وہ کسی بھی ملک کا نام نہ لے سکے

پھر انھوں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انڈیا کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ رہا ہے۔ انڈیا کی اقتصادی کمزوری ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ انڈیا کی اقتصادی طاقت تباہ ہوگی اور وہ کشمیر کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ دونوں فریقوں کے ساتھ ہے۔ اور اس میں اصل فیصلہ کن چیز وقت ہے۔ آپ اور انڈیا میں سے جس فریق کی اقتصادی طاقت پہلے ٹوٹے گی وہ دوسرے فریق کی جیت کا باعث بنے گی۔ ایسی حالت میں آپ کے پاس کون سی مزید دلیل ہے جس کی بنا پر آپ یہ یقین کر رہے ہیں کہ انڈیا کی اقتصادی حالت آپ سے پہلے تباہ ہو جائے گی۔ اس کا بھی ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نام نہاد لیڈرشپ کتنا زیادہ بے شعور ہے۔ پچھلے دو سو سال سے ایک ہی نادانی مسلمانوں کے درمیان جاری ہے۔ کچھ نااہل افراد پر جوش طور پر قیادت کے میدان میں کود پڑتے ہیں، حالاں کہ بے شعوری کے سوا ان کے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ افراد صرف مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔ خود ساختہ قائدین کے اس پورے گروہ پر انگریزی کی یہ مثل صادق آتی ہے کہ نادان لوگ وہاں گھس پڑتے ہیں جہاں فرشتے بھی قدم رکھنے سے ڈرتے ہیں:

Fools rush in where angels fear to tread.

ٹائم میگزین (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) ۳ جنوری کی ڈاک میں ملا۔ اس سے پہلے اس کے ۲۰ دسمبر ۹۳ کے شمارہ کی کور اسٹوری امریکہ میں بڑھتے ہوئے تشدد کے بارہ میں تھی۔ موجودہ شمارہ میں اس

سے متعلق قارئین کے خطوط شائع ہوئے تھے۔ ان خطوط میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر دن تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔ امریکی دستور کی مشہور دوسری ترمیم (second amendment) نے ہتھیار رکھنے کو ایک امریکی کا شہری حق قرار دیدیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہاں ایجوکیشن یا جاب حاصل کرنے سے بھی زیادہ آسان گن حاصل کرنا ہوگیا ہے۔ حتی کہ مسٹر مارک جیرول (Mark Jerol) کے الفاظ میں، امریکہ کے گن پرابلم کی وجہ سے ہم ایک زندہ جہنم (living hell) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک جرمن قاری (Elke Zschaebitz) نے لکھا تھا کہ امریکی دنیا کی واحد قوم ہیں جو محفوظ زندگی سے بھی زیادہ گن رکھنے کے حق کی حمایت کرتے ہیں :

> Americans are the only people who support the right to own a gun rather than the right to walk safely along the street or to feel secure in their homes. (p. 6)

سان ڈیگو کے (Ray R. Dunakin III) نے لکھا تھا کہ امریکہ میں سنگین جرائم کی موجودگی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مجرم کو سزا نہیں ملتی۔ ہم کو آج گن کنٹرول کی ضرورت نہیں بلکہ کرائم کنٹرول کی ضرورت ہے :

> Criminals who commit serious crimes are given light sentences and turned back onto the streets to rob or kill again and again. We don't need gun control, we need crime control.

ایک فلسطینی نوجوان سے اسلامک سوسائٹی (آرینج کاونٹی) میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے بعد انھوں نے فرائڈے رپورٹ (The Friday Report) کے تین شمارے برائے مطالعہ دئے۔ یہ دار مکہ ڈینور (Denver) کی طرف سے ہر ماہ "اسلامک نیوز لیٹر" کے طور پر شائع ہوتا ہے۔

(Tel. 303-6912201)

اس نیوز لیٹر کے شمارہ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۳ (جمادی الاول ۱۴۱۴ھ) کے اڈیٹوریل میں فلسطین کے حالیہ معاہدہ کو غیر نمائندہ افراد کی طرف سے فلسطین کی فروخت (sale) قرار دیا گیا تھا۔ ایک صفحہ فتاوی کا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ فتاوی اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء کی طرف سے دئے گئے ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک غیر اسلامی ملک میں ایک مسجد بیچ کر دوسری زیادہ بڑی جگہ خریدی جائے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ بیچنا اور جگہ کا بدلنا دونوں جائز ہے۔

Q. Is it permissible to sell a mosque in a non-Islamic country in order to buy a bigger one?

A. If the mosque is ruined or not big enough and they have to demolish or sell it, it is permissible to sell it and to buy or build another one or transfer it to another place for the interest of the Muslims. (p. 3)

اس کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کا فتویٰ اگر انڈیا کا کوئی عالم دے تو شاید فوراً ہی دوسرا جوابی فتویٰ شائع ہوگا جس میں اعلان کیا جائے گا کہ جس شخص نے ایسا فتویٰ دیا ہے وہ مباح الدم ہے، اس کو ذلت کے ساتھ قتل کر دینا چاہئے۔ مگر امریکہ میں یہ فتویٰ چھپ رہا ہے اور انٹرنیشنل سیرت کانفرنس میں وہ تقسیم کیا جا رہا ہے مگر کوئی اس کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں۔ ہندستان اور امریکہ کا یہی فرق ہے جس نے ایک ملک کو مسلمانوں کے لئے فساد کا ملک بنا دیا ہے اور دوسرے کو امن کا ملک۔

۳ جنوری کی شام کو مجھے جناب صفی قریشی صاحب کے یہاں جانا تھا۔ صغیر اسلم صاحب کے ساتھ روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم لوگ ایک خاص مقام سے گزرے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پہلے ہم لوگ یہاں رہتے تھے۔ یہاں ان کے پاس چھ ہزار مربع فٹ کا مکان تھا۔ خوبصورت پارک کے کنارے کا یہ مکان بہت وسیع اور بہت شاندار تھا۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے اس کو چھوڑ کر مسجد کے قریب چھوٹا مکان لے لیا۔ یہ دوسرا مکان دو ہزار مربع فٹ کا ہے۔ علاقہ کے لحاظ سے بھی پہلا مکان نہایت اہم علاقہ میں تھا۔ جب کہ موجودہ مکان دوسرے درجہ کے علاقہ میں ہے۔ جب انھوں نے یہ مکان بدلا تو اکثر لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اتنا اچھا مکان چھوڑ کر معمولی مکان میں آ گئے۔

یہاں ہر آدمی بچوں کے بگڑنے کی شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ شکایت میرے نزدیک بے معنی ہے۔ اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق بچوں سے زیادہ ان کے بڑوں سے ہے۔ بڑے لوگ اپنے چاہنے کی قیمت ادا نہیں کرتے اسی لئے وہ اپنے بچوں کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو آخرت پسند بنانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر کے ماحول کو دنیوی شان و شوکت سے پاک کرنا ہوگا۔ اس کے بجائے اپنے آپ کو مسجد والے ماحول سے قریب کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ پوری ملت کا ہے۔ لوگ جو کچھ چاہتے ہیں، اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوب چیز بھی ان کو نہیں ملتی۔ مثلاً ہر آدمی اتحاد کی بات کرتا ہے مگر وہ اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ یہی اتحاد کی واحد قیمت ہے۔ لوگ دعوت کی بات کرتے ہیں، مگر وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ مدعو کی زیادتیوں پر صبر کئے بغیر دعوت کا عمل ممکن ہی نہیں۔ لوگ ملت کی تعلیم وترقی کی بات کرتے ہیں مگر وہ نزاعات کو اوائڈ کرنے کے لئے تیار نہیں، حالاں کہ تعلیم وترقی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نزاعات کو ہر حال میں اوائڈ کیا جائے۔

۳ جنوری کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں فیکس پر ایک خط آیا۔ یہ خط لیزبرگ (Leesburg) سے آیا تھا جو امریکہ کے ایسٹ کوسٹ میں واقع ہے۔ اس پر مزانڈا ڈی ہایوز (Inda de Hoyos) کا دستخط تھا۔ انھوں نے دعوت دی تھی کہ میں امریکہ سے رخصت ہونے سے پہلے ان کے ادارہ میں آؤں۔ تاہم وقت کم ہونے کی وجہ سے میں سفر کا پروگرام نہ بنا سکا۔ (Tel. 03-882-4771)

مذکورہ خاتون ایک امریکی ادارہ کے ایشیائی شعبہ کی صدر ہیں۔ اس ادارہ کا نظریہ یہ ہے کہ اضافہ آبادی کے بارہ میں مالتھس کا نظریہ غلط تھا۔ زمین میں زندگی کے ذرائع اتنے زیادہ ہیں کہ ہمیں مصنوعی طور پر آبادی پر کنٹرول کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف وسائل ارض کو درست طور پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن (صفحہ ۲۳-۲۶) کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ وہ ان کو بہت پسند آیا۔ چنانچہ ان کا خیال تھا کہ میں ان کے ادارہ میں آؤں اور وہاں اس موضوع پر مزید لکچر دوں۔ مگر ان کا پیغام مجھے دیر سے ملا اس لئے میں وہاں کا پروگرام نہ بنا سکا:

Inda de Hoyos, 62 Sycolin Road, Leesburg, Va 22075
Tel. 703-777-9451, 03-882-4771. Fax 703-771-9492

۳ جنوری کی شام کو اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں نماز عشاء کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے کچھ احادیث کی روشنی میں دین کی تفہیم کی۔ ان حدیثوں کا تعلق دین کی اسپرٹ سے تھا۔

۴ جنوری کی شام کو جناب جاوید نواز صاحب کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کچھ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ یہاں میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ اس میں بتایا کہ ہمیشہ مسائل کے ساتھ مواقع موجود رہتے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ مسائل کو نظر انداز کریں اور مواقع کو استعمال کریں۔

آخر میں سوال وجواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ امریکہ میں مسلم نسلوں کے (assimilation) کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ چھ ملین مسلمانوں کے درمیان یہاں چھوٹی بڑی ڈیڑھ ہزار مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں خاص طور پر جمعہ کے دن معقول تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اجتماع عبادت سے زیادہ سوشلائزنگ کے لئے ہوتا ہے۔ ترکی اور سوویت یونین میں مسلمانوں نے اپنا تشخص نہیں کھویا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں چیلنج تھا۔ چیلنج ہمیشہ مقاومت (resistance) پیدا کرتا ہے اور وہ زندگی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ امریکہ میں یہ چیلنج نہیں اس لئے یہاں مسلمانوں کے لئے جذب ہو جانے کا خطرہ نظر آتا ہے۔

تاہم ایک پر امید علامت یہ ہے کہ خبروں کے مطابق، امریکی حکومت اسلام کو مغربی تہذیب کے دشمن کے طور پر پروجیکٹ کر رہی ہے۔ اگر فی الواقع یہ امریکی ایڈمنسٹریشن کا سوچا سمجھا فیصلہ ہو تو یہ چیز مسلمانوں کی بقاء کی ضامن بن جائے گی۔ کیوں کہ اس کے بعد یہاں بھی چیلنج اور اس کے جواب میں مقاومت کا ماحول بن جائے گا جو اسلامی تشخص کے بقاء کی ضمانت ہوگا۔

ہندستان کے جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے نام پر بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ تنظیمی اعتبار سے یہ سب الگ الگ ہیں۔ مگر طرز فکر کے اعتبار سے سب کی سب یکساں ہیں۔ ہر گروہ ہندستانی مسلمانوں کا تعارف مظلوم فرقہ (oppressed community) کی حیثیت سے کراتا ہے اور ہندوؤں کا تعارف جنگجو ہندو (Hindu militants) کی حیثیت سے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان بھی ویسا ہی ایک ملک ہے جیسا کہ امریکہ۔ ہندستان میں نہ مسلمان مظلوم ہے اور نہ ہندو ظالم۔ جو بگاڑ وہاں آپ دیکھتے ہیں

اس کے اصل ذمہ دار نا اہل مسلم لیڈر ہیں۔ ان کے نکمے لیڈروں نے پچھلے سو سال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو غیر ضروری طور پر ایک دوسرے سے متصادم رکھا ہے۔ آپ لوگوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس قسم کے نکمے لیڈر آپ کے یہاں نہیں اٹھے یا آپ لوگوں نے انھیں اٹھنے نہیں دیا۔ اگر امریکہ میں اسلام کے نام پر وہی ہنگامے جاری ہو جاتے جو برصغیر ہند میں جاری کئے گئے تو امریکہ بھی آپ کے لئے ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آپ انڈیا کو سمجھتے ہیں۔

امریکہ میں دو ہفتہ تک رہا۔ اس مدت میں وہاں کبھی بجلی فیل نہیں ہوئی۔ ٹیلی فون کبھی ڈیڈ نہیں ہوا۔ کبھی سڑکوں پر ہارن کی آواز نہیں آئی۔ کبھی مجھے لاؤڈ اسپیکر کا شور سننے پر مجبور نہیں ہونا پڑا۔ فٹ پاتھ پر کہیں خوانچہ فروش نظر نہیں آئے۔ کہیں کوئی گداگر دکھائی نہیں دیا۔ بے شمار گاڑیوں کے باوجود سڑکوں پر پولیوشن بہت کم تھا۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کا کوئی وجود نہ تھا۔ غرض زندگی ہر اعتبار سے پر راحت تھی۔ گھر، سڑک، بازار، دفاتر، ہر جگہ صفائی اور باقاعدگی نظر آتی تھی۔

اس کے بعد جب سفر سے واپس آیا اور دہلی میں داخل ہوا تو یہاں ہر چیز بالکل مختلف تھی۔ وہاں اگر ہر چیز اعلیٰ تھی تو یہاں ہر چیز ادنیٰ نظر آئی۔ تاہم میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے ہندستان چھوڑ دینا چاہئے اور امریکہ میں جا کر رہنا چاہئے۔ امریکہ بلاشبہ ہندستان کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کے باوجود میں ہندستان کو اور صرف ہندستان کو پسند کرتا ہوں۔ کیوں کہ ہندستان میرا وطن ہے۔ میری تمنا ہے کہ میرا ملک بھی دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح اعلیٰ ترقی کرے۔

دوسروں کی ترقی میں جینا مجھے اپنی غیرت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ میں خود اپنے وطن کی ترقی میں جینا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اپنی عمر میں ایک ترقی یافتہ ہندستان نہ ملے تو یہ احساس بھی میرے اطمینان کے لئے کافی ہے کہ ہندستان کے مستقبل کی تعمیر میں کچھ اینٹیں میں نے بھی اپنے کمزور ہاتھوں سے رکھی تھیں۔

۵ جنوری ۱۹۹۴ کو واپسی کا دن تھا۔ گارڈن گروو سے لاس اینجلیز کے لئے جناب عبدالحمید سیمی اور جناب حبیب الدین ملک کے ساتھ روانگی ہوئی۔ حبیب الدین ملک صاحب کا تعلق

پشاور سے ہے۔ انھوں نے افغانستان کی جنگ میں عملی حصہ لیا ہے۔ وہ اس زمانہ میں افغانستان گئے تھے جب کہ روسی فوجیں واپس جاچکی تھیں مگر ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت ابھی باقی تھی۔ انھوں کہا کہ میرا یہ ارمان رہ گیا کہ اس جہاد میں مجھے کوئی زخم لگتا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔

میں نے پوچھا کہ اب تو افغانستان سے روس واپس جاچکا ہے۔ اب سب کے سب افغانی لوگ وہاں ہیں۔ حتی کہ حکمتیار اور برہان الدین دونوں مجاہدین کے سردار تھے۔ پھر یہ باہمی لڑائی کیوں ابھی جاری ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ اقتدار۔ لیکن اگر یہ اقتدار کی جنگ ہے تو اس سے پہلے وہاں جہاد کی جنگ نہ تھی۔ اور اگر وہ جہاد کی جنگ تھی تو اب اقتدار کی جنگ نہ ہونا چاہئے۔

ہوائی اڈہ تک ایک گھنٹہ کا سفر "فری وے" کے ذریعہ طے ہوا۔ کہیں بھی ریڈ لائٹ نہیں آئی اور نہ گاڑی روکنے کی ضرورت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فری وے کی سڑکوں پر کراسنگ نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں کراسنگ ہوتی ہے وہاں اوور برج بنا دیا جاتا ہے تاکہ گاڑیاں اوپر سے گزر سکیں۔ ایئر پورٹ کے پاس پہنچے تو سڑک کے اوپر رن وے بنا ہوا تھا۔ اوپر سے جہاز دوڑ رہا تھا اور نیچے سے کار۔

لاس اینجلیز سے سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۰۷ کے ذریعہ سفر ہوا۔ مقامی وقت کے لحاظ سے رات کو ۹ بجے جہاز یہاں سے روانہ ہوا۔ ۹۵۶۰ کیلو میٹر کی نان اسٹاپ پرواز تھی، ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا یہ جہاز ساڑھے دس گھنٹہ میں زیورک پہنچا۔ اس وقت زیورک میں شام کے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا اور جنوری ۱۹۹۴ کی ۶ تاریخ۔ یہ سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ مگر نیند اللہ تعالی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ راستہ میں بار بار گہری نیند آتی رہی اور یہ سفر بآسانی طے ہو گیا۔

راستہ میں سوئس ایئر کا فلائٹ میگزین سوئس ایئر گزٹ (جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ اس کا ایک مضمون اس موضوع پر تھا کہ آسمان نیلا کیوں ہے (why is the sky blue) اس سلسلہ میں مختلف تفصیلات درج تھیں۔ زمین سے ہم سورج اور آسمان کو گیسوں کی ۵۰ کیلو میٹر موٹی چادر (thick sheet) کے واسطہ سے دیکھتے ہیں جس کو فضا (atmosphere) کہا جاتا ہے۔

آسمان میں جو رنگ ہم دیکھتے ہیں وہ اسی فضا کے اوپر سورج کی روشنی کے فزیکل ری ایکشن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں لارڈ ریلے (Lord Rayleigh) نے اس کی تحقیق کی۔ ان کی تشریح نے بتایا کہ آسمان کا نیلا پن ہر ایک گرام ہوا میں کئی بلین ایٹم کا نتیجہ ہوتا ہے:

His explanation showed that the blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air. If air had no atomic structure, the sky would not scatter light. (p. 31)

مضمون میں مزید بتایا گیا تھا کہ ہماری کہکشاں (Milky Way) میں ایک سو بلین ستارے ہیں۔ مزید یہ کہ اس طرح کی تقریباً ایک سو بلین کہکشائیں وسیع کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات کی یہ وسعت کتنی زیادہ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو اتنا زیادہ عظیم اس لئے بنایا تاکہ انسان خالق کائنات کی انتہاء عظمت کا تصور کر سکے۔

۶ جنوری کی شام کو زیورک پہنچا۔ یہاں مجھے اگلے جہاز کے لئے تقریباً ڈیڑھ دن ٹھہرنا تھا۔ یہاں ویزا لینا تھا۔ اس کے بعد سوئس ایرویز کی طرف سے ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا جاتا۔ زیورک کا ایرپورٹ بہت بڑا ہے اور ادھر سے ادھر جانا، اس کاونٹر سے اُس کاونٹر پر کھڑا ہونا میرے بس میں نہیں۔ میں نے ایرپورٹ کے ایک نوجوان مسٹر اوور ایگیٹر (Ouver Aegeter) سے کہا۔ انھوں نے میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ لیا۔ سارے کام خود ہی کرائے۔ اس کے بعد ایرپورٹ کے اندر چلنے والی مخصوص کھلی کار میں بٹھا کر وہاں پہنچا دیا جہاں مجھ کو ٹھہرنا تھا۔

ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے ان کا نام پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ کیا آپ میری کمپلینٹ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں میں آپ کی تعریف کرنے کے لئے آپ کا نام پوچھ رہا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک کاغذ پر اپنا پورا نام لکھ کر دیا۔

زیورک ایرپورٹ پر اتفاقاً ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ کیپٹن پی کے سنگھل تھے۔ وہ دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 5592315) اور انڈین لائنز میں پائلٹ ہیں۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں حسب عادت ہوابازی کے متعلق سوالات کرتا اور وہ ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پرواز کے دوران کسی پائلٹ کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال کون سی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا —— جب آپ کو رن وے نہ ملے لینڈ

کرنے کے لئے۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار ان کے ساتھ ایسا ہوا کہ جس ہوائی اڈہ پر انھیں اترنا تھا وہاں سخت فاگ تھا۔ اس لئے وہ وہاں اپنا جہاز اتار نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے آس پاس کے کئی مقامات سے بذریعہ وائرلیس ربط قائم کیا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ ایئر پورٹ کے اوپر گہرا کہر چھایا ہوا ہے۔ اس کے بعد بمبئی جاکر انھوں نے اپنا جہاز اتارا۔ خوش قسمتی سے انھوں نے زیادہ پٹرول لے لیا تھا ورنہ بمبئی پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔

زندگی میں بھی اس طرح کے نازک لمحات آتے ہیں جب کہ مطلوب منزل کی طرف بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس وقت آدمی کے اندر اتنی بصیرت ہونی چاہئے کہ وہ یہ جان سکے کہ دوسرے کون سے مقامات ہیں جس طرف وہ اپنے سفر کے رخ کو موڑ سکتا ہے۔

زیورک سے بہت سی تاریخی داستانیں وابستہ ہیں۔ آئن سٹین کے سوانح نگار رونالڈ کلارک (Ronal W. Clark) نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ میں زیورک یونیورسٹی میں نظریاتی طبیعیات (theoretical physics) کے شعبہ میں ایک پروفیسر کی ضرورت تھی۔ آئن سٹین اس کے لئے امیدوار تھا۔ لیکن بورڈ آف ایجوکیشن نے بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے آئن سٹین کو نہیں لیا۔ اس کے بجائے انھوں نے فریڈرش ایڈلر (Friedrich Adler) کا تقرر کر دیا۔

مگر نوجوان ایڈلر ایک انوکھا آدمی تھا جس میں علمی دیانت داری غیر معمولی حد تک پائی جاتی تھی۔ بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ اگر وہ اس پوسٹ پر نہ ہوتا اور اس کی پیش کش آئن سٹین کو کی جاتی تو وہ اس کو قبول کر لیتا۔ اس نے کہا کہ محض سیاسی اسباب سے ہمیں ایسا موقع کھونا نہیں چاہئے جب کہ ہم ایک ایسے شخص کو پا سکتے ہیں جو یونیورسٹی کے معیار کو بہت زیادہ بڑھا دینے والا ہے۔ اس نے بورڈ آف ایجوکیشن کو اپنا استعفا بھیجتے ہوئے لکھا کہ اگر یہ ممکن ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی کے لئے آئن سٹین جیسے لائق شخص کو پا سکتے ہیں تو اس پوسٹ پر میرے جیسے ایک آدمی کو رکھنا بالکل لغو ہوگا۔

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہوں گا کہ طبیعیاتی عالم کی حیثیت سے میرا اور آئن سٹین کا کچھ بھی مقابلہ نہیں:

If it is possible to obtain a man like Einstein for our university, it would be absurd to appoint me. I must quite frankly say that my ability as a research physicist does not bear even the slightest comparison to Einstein's. (p. 165).

واضح ہو کہ یہ بات ۱۹۰۸ کی ہے جب کہ آئن سٹین کو ابھی عظمت کا مقام نہیں ملا تھا۔ پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اس کو عالمی شہرت حاصل ہوئی جب کہ اس کے نظریہ اضافیت کو سائنس دانوں نے قبول کر لیا۔ اس کے دو سال بعد اس کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

زیورک ایئر پورٹ پر ایک مسافر سے لے کر ریڈرس ڈائجسٹ (دسمبر ۱۹۹۳) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون شراب نوشی کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانا قتل کا لائسنس:

Drunk driving : a license to kill

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ کی سڑکوں پر ہر ۳۰ منٹ میں ایک مرنے والا وہ ہوتا ہے جس کا تعلق شراب نوشی سے متعلق ایکسیڈنٹ سے ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے واقعات درج کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ شراب پی کر گاڑی چلانے والا جب کسی کی موت کا سبب بنتا ہے اور اس پر کیس چلایا جاتا ہے تو یا تو وہ بچ جاتا ہے یا معمولی سزا پر چھوٹ جاتا ہے:

How long must it be — and how many must die — before we make the punishment fit the crime? (p. 132)

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو نام نہاد جدید تعزیرات (modern penology) کا حوالہ دے کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کا قانون سزا وحشیانہ ہے۔ دوسری طرف انسانی فطرت جدید نظریہ سزا کے خلاف احتجاج کر رہی ہے کہ اس نے مجرموں کے حق میں نرم رویہ اختیار کر کے جرائم کو اتنا زیادہ بڑھا دیا ہے کہ اب پورا انسانی سماج اس کی زد میں ہے۔

۷ جنوری کو زیورک سے دہلی کے لئے سوئس ایئر کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں مختلف اخبار اور رسالے کا مطالعہ جاری رہا۔ سوئس ایئر کی فلائٹ میگزین میں ایک مضمون خلا کے بارہ میں تھا۔ اس میں بہت سی سائنسی معلومات درج تھیں۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ زمین سے جب ہم آسمان کو دیکھتے ہیں تو ہمارا یہ مشاہدہ براہ راست نہیں ہوتا بلکہ ۵۰ کیلومیٹر موٹی چادر درمیان میں حائل ہوتی ہے جو مختلف قسم کی گیسوں سے بھری ہوئی ہے۔ آسمان کا نیلا رنگ جو ہم زمین سے دیکھتے ہیں وہ اسی درمیانی چادر میں ہونے والے طبیعیاتی ردعمل (physical reaction) کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آسمان کا نیلاپن ہر ایک گرام ہوا میں اربوں ایٹم کی موجودگی کا نتیجہ ہے:

The blueness of the sky implies many billion atoms in every gram of air.

رنگ کی مختلف قسموں میں سے آسمان کے لئے نیلے رنگ کا انتخاب ایک اعلیٰ ذہانت کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ اس سے بہتر کوئی رنگ تصور میں نہیں آتا۔ اسی طرح زمین پر سبزہ کے لئے ہرے رنگ کا انتخاب آخری اعلیٰ انتخاب ہے۔ اگر آدمی صرف ان دو رنگوں پر غور کرے تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اس کائنات کے پیچھے ایک خدائی ذہن کارفرما ہے۔ کیوں کہ ایک برتر خدائی ذہن کے بغیر اس قسم کا آخری بہتر انتخاب ممکن ہی نہیں۔

۷ جنوری ۱۹۹۴ کی دوپہر کو سوئس ایئر کی فلائٹ ۱۹۴ کے ذریعہ میں زیورک سے دہلی کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز روانہ ہوا تو کیپٹن کی طرف سے اعلان ہوا کہ آپ جس جہاز پر سوار ہیں وہ انتہائی ترقی یافتہ مواصلاتی نظام سے لیس ہے۔ آپ جہاز کے اندر سے کسی بھی وقت کسی بھی مقام کے لئے ٹیلیفون کرسکتے ہیں۔

راستہ میں انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون (۷ جنوری ۱۹۹۴) پڑھا۔ ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن کی والدہ کیلی (Virginia Kelley) کا ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تین نکاح کئے۔ پہلے شوہر کا انتقال کار اکسیڈنٹ میں ہوگیا۔ یہ حادثہ مستقبل کے صدر امریکہ کی پیدائش سے چار ماہ پہلے پیش آیا:

He died in a car accident about four months before the future president was born

جہاز دلی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ہندستانی وقت کے لحاظ سے رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔

اس وقت ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا —— اس دنیا میں انسان کے لئے قابل حصول لذت صرف ایک ہے۔ وہ ہے اللہ کی یاد میں رونا۔ اللہ کی یاد میں رونا انسانی روح کے لئے لذیذ اس لئے ہے کہ وہ خدائے کامل سے قربت کا لمحہ ہوتا ہے۔ اس کے سوا جن چیزوں کو انسان لذت سمجھے ہوئے ہے وہ فریب لذت ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں لذت۔

رات کو ۱۲ بجکر دس منٹ پر جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے ہم جنوری کی آٹھویں تاریخ میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی طرح ایک دن ختم ہو کر دوسرا دن آتا رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ آخری دن آجائے گا جب کہ انسان محدود دنیا سے نکل کر ابدی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۲

۱- ٹائمس آف انڈیا کے نمایندہ مسٹر سجاد حسن نے ۱۶ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسلمان ملک کی مین اسٹریم سے الگ کیوں ہیں۔ کہا گیا کہ یہ بات صرف جزئی طور پر درست ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں مسلمان ہر جگہ برادر وطن کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہ مین اسٹریم سے کلی معنوں میں الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ مسلمانوں کے اخباری لیڈر اپنے بے بنیاد بیانات کے ذریعہ غلط طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ مسلمان دوسروں سے بالکل الگ ہیں۔

۲- الرسالہ مشن شروع سے اس پر زور دیتا رہا ہے کہ مسلمان سیاست کے بجائے تعلیم کے میدان میں اپنی کوشش صرف کریں۔ اس سلسلہ میں خدا کے فضل سے کئی جگہ ہمارے ساتھی قابل قدر کام کر رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک جموں کا علاقہ ہے۔ جموں میں جناب فاروق مضطر صاحب، جناب خورشید بسمل صاحب، مولانا لال الدین صاحب وغیرہ تعلیم کے میدان میں نہایت مفید کام کر رہے ہیں۔ اسی انداز پر ہر جگہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳- ہفت روزہ نئی دنیا کے نمایندہ مسٹر جمال فہمی نے ۱۹ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر مسجد کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسجد باجماعت نماز کا مرکز ہے۔ یہ باجماعت نماز ایک عالم کی امامت میں ادا کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد اس بات کی تربیت ہے کہ مسلمان علماء دین کی سربراہی کے تحت متحد ہو کر زندگی گزاریں۔

۴- آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا روزہ اور جمعہ کی اہمیت۔

۵- فرانس کی ایک خاتون اسکالر امیلی بلوم (Ms Amelie Blom) ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو اسلامی مرکز میں آئیں اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ وہ پیرس کے ادارہ سنٹر آف انٹرنیشنل اسٹڈیز اینڈ ریسرچ کے تحت پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہی ہیں۔ ان کی ریسرچ کا تعلق اس مسئلہ سے تھا کہ سلمان رشدی کی کتاب سیٹنک ورسز کا ری ایکشن انڈیا اور برطانیہ

میں کیا ہوا۔ اور اس کا اسلامی حکم کیا ہے۔ اس معاملہ میں انھیں تفصیل کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۶۔ فرینچ نیوز ایجنسی کے نئی دہلی کے نمایندہ مسٹر نارائن سوامی نے ۲ مارچ ۱۹۹۵ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ وشو ہندو پریشد بنارس کی گیان واپی مسجد کو توڑنا چاہتی ہے۔ بتایا گیا کہ مسجد کا ٹوٹنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان بھڑک کر انھیں اس کا موقع دیں۔ اگر مسلمان صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کریں تو وشو ہندو پریشد کبھی بھی اپنے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوگی۔ ۲۷ فروری کو مسلمانوں نے اس پالیسی پر عمل پر کیا۔ چنانچہ ہر قسم کی سازش کے باوجود مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

۷۔ ہندی روزنامہ جن ستا کے نمایندہ مسٹر صفدر رضوی نے ۲۵ فروری ۱۹۹۵ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بنارس اور متھرا کے مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ۱۹۹۱ میں عبادت گاہوں کے تحفظ کا جو ایکٹ پاس ہوا ہے اسی کو تمام فریقوں کو مان لیا جائے۔ اس کو نہ ماننا ملک میں لاقانونیت اور نراج لانے کے ہم معنی ہے۔

۸۔ ڈاکٹر نگیندر سنگھ، ڈائرکٹر انڈو یورو پین جین ریسرچ فاؤنڈیشن (نئی دہلی) اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۱۱ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی اور تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ مغربی مصنفین عام طور پر یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمان میں فرق نہیں کرتے۔ وہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً آج کل جگہ جگہ اسلام کے نام پر گن کلچر چلایا جا رہا ہے وہ محض کچھ مسلم لیڈروں کی سیاست ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

۹۔ مسٹر جمال صفی (فری لانس جرنلسٹ) نے ۱۴ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق پاکستان میں بڑھتے ہوئے مذہبی تشدد سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ پاکستان اس نظریہ کے تحت قائم کیا گیا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ مگر پاکستان کے تجربہ نے ثابت کیا کہ اختلاف زندگی کا حصہ ہے، اور وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اس لیے کامیاب زندگی کا حل صرف ایک ہے ——— اختلاف کے باوجود

ایک دوسرے کا احترام کرنا اور اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے مل جل کر رہنا۔

۱۰۔ اُردو ویکلی راشٹریہ سہارا کے سینیر سب ایڈیٹر مسٹر اسد رضا نے ۱۹ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اس وقت پاکستان میں جو باہمی لڑائیاں ہو رہی ہیں اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان کے بانیوں پر ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو عدم رواداری کا سبق دیا۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے پر تیار نہیں ہوئے۔ یہی مزاج وہاں کام کر رہا ہے۔ پہلے وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں بے برداشت ہوئے تھے، اب وہ خود مسلمانوں کے مقابلہ میں بے برداشت ہو رہے ہیں۔ اس کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں برداشت اور رواداری کا مزاج پیدا کیا جائے۔

۱۱۔ ایشین نیوز انٹرنیشنل (ٹی وی) کی ویڈیو ٹیم ۲۱ مارچ ۱۹۹۵ کو مرکز میں آئی اور صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کی انتخابی پالیسی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ایک سے غصہ ہو کر دوسرے کو ووٹ دینا یہ کوئی پالیسی نہیں ہے۔ الکشن میں منفی جذبات سے اوپر اٹھ کر ووٹ دینا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ کسی پارٹی کا انتخاب کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس نے ہماری خواہشوں کو پورا کیا یا پورا نہیں کیا۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ حالات کے تحت وہ جو کچھ کر سکتی تھی اس کو کیا یا نہیں کیا۔

۱۲۔ انگلش میگزین انڈیا ٹوڈے کی پرنسپل کرسپانڈنٹ مسز شیفالی ریکھی نے ۲۱ مارچ ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع "مسلمانوں کی مذہبی رسوم" تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈیا کے مسلمانوں میں بہت سی رسمیں ہندوؤں کے اثر سے آئی ہیں۔ ہندوؤں میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے سابق مزاج کے تحت ہندو رسموں کو اسلامی صورت دے کر منانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسمیں صرف برصغیر ہند کے مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ عرب ملکوں میں یہ رسمیں سرے سے موجود نہیں ہیں۔

۱۱۔ غالب اکیڈمی (نظام الدین بستی) میں ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ کو "عید ہولی ملن" کے نام سے ایک جلسہ ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں "مہمان خصوصی" کی حیثیت سے شرکت کی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ اکثر غلط فہمیاں محض دوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔
اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	\$20 / £10	\$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	\$35 / £18	\$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	\$50 / £25	\$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	\$80 / £40	\$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	\$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں، پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اُردو	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	50/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	70/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	40/-
راز حیات	50/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	70/-
اسلام اور عصر حاضر	50/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	–
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	95/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمت مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعہ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	100/-
کتاب زندگی	55/-
انوار حکمت	–
اقوال حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	35/-
عقلیات اسلام	50/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	8/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرہویں صدی میں	10/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحاد ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	20/-
حقیقت کی تلاش	12/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	12/-
حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-

نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعدد ازدواج	10/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	12/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	2/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرت رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدی (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتک واد اور اسلام	10/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ	Rs.
حقیقت ایمان	25/-
حقیقت نماز	25/-
حقیقت روزہ	25/-
حقیقت زکوٰۃ	25/-
حقیقت حج	25/-
سنت رسولؐ	25/-
میدان عمل	150/-
رسول اللہ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے	25/-
جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحاد ملت	25/-
تعمیر ملت	25/-
نصیحت لقمان	25/-

God Arises	Rs. 85/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	10/-
Words of the Prophet	–
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-

AL-RISAL BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



Al-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013

Tel. 4611128, Fax 4697333